کلیاتِ مصحفی

جلد ہشتم

مشتمل بر

دیوان ہشتم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نورالحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ ا۔ آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110006

کلیاتِ مصحفی

جلد ہشتم

مشتمل بر

دیوان ہشتم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نور الحسن نقوی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

سنہ اشاعت

پہلا ایڈیشن : فروری 2007

تعداد : 550

قیمت : -/85 روپئے

سلسلۂ مطبوعات : 1278

Kulliyat-e-Mus'hafi Vol. VIII
by
Prof. Noorul Hasan Naqvi

ISBN : 81-7587-205-5

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

فون : 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل : urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی- 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثرنگاروں سے لے کر عہدِ جدید کے شاعروں اور نثرنگاروں تک تمام اہم اہلِ فکروفن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

رشمی چودھری
ڈائرکٹر انچارج

فہرست

(غزلیات)

پروفیسر شمیم حنفی:

مصحفی کا شعر

مصحفی کی شاعری سے ہمارا تعارف ایک عجیب و غریب دورا ہے کے پس منظر میں ہوتا ہے۔ یہ پس منظر ہماری تہذیبی تاریخ اور ہماری ادبی روایت دونوں کے عناصر مرتب کرتے ہیں۔ اس کا تجزیہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصحفی اپنی حسیّت کی تشکیل میں کتنے پیچیدہ مرحلوں اور مشکلوں سے گزرے ہوں گے۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنے مضمون ''مصحفی اور ان کی شاعری'' (مشمولہ غزل سرا، اشاعت 1964ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) میں مصحفی کی اس آزمائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے تاریخِ شعرِ اردو میں مصحفی بالکل اکیلے ہیں اور کیا اس سے پہلے اور کیا اس کے بعد، اُن کا ساتھ دینے والا اور اُن کی ہم نوائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ بیک وقت ماضی کی یادگار اور حال کی کشاکش میں مبتلا اور مستقبل کے میلانات کا اشاریہ ہیں۔ متقدمین کے گائے ہوئے راگ نہ صرف اُن کے کانوں میں بلکہ اُن کی ہستی کی ایک ایک تہہ میں گونج رہے تھے۔ لیکن خود اُن کے زمانے میں دوسرے راگوں کی مانگ تھی، جن کے موجد جرأت اور انشا تھے۔ نتیجہ ایک لطیف اور پُر کیف قسم کی انتخابیت تھی جو مصحفی کے دم سے شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہوئی''۔ (غزل سرا،ص:116)

کسی بھی ایسے دور میں زندہ رہنا اور اپنی تخلیقی شخصیت اور مزاج کی تعمیر کرنا، جب دو زمانے گلے مل رہے ہوں اور احساس و افکار کی دو روایتوں میں پیکار بھی جاری ہو، ایک

مشکل مرحلہ ہے، خاص طور پر اس لیے بھی کہ مصحفی کے عہد میں وقت کی رفتار بہت تیز نہیں تھی اور شخصیتیں کسی بھی تبدیلی کو قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوتی تھیں۔ اسی لیے، عہدِ مصحفی کے سیاق میں دلّی اور لکھنؤ کے دبستانوں کی خانہ بندی اور دونوں کی روایات کا الگ الگ تشخص قائم کرنا بھی اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ بالعموم سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ دونوں ادبی اسکول ایک دوسرے کے علاقۂ اقتدار میں متواتر مداخلت کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے پر خاموشی سے اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ دبستانِ دہلی کی معروف و مشہورِ زمانہ داخلیت اور دبستانِ لکھنؤ کی مذموم و معتوب خارجیت کے سرچشمے جغرافیائی اور تہذیبی لحاظ سے دور افتادہ یہ دو شہر نہیں تھے۔ یہ تو دو ذہنی، جذباتی اور حسّی رویّے تھے جن کا ظہور ایک ہی شہر اور شخصیت کی تہہ سے بھی ممکن ہوسکتا تھا۔ میرؔ و میرزا سے داغؔ تک اور آتشؔ و ناسخؔ و مصحفی سے جلال لکھنوی تک، کون سا ایسا قابلِ ذکر غزل گو ہے جس کے یہاں داخلیت اور خارجیت کی دھوپ چھاؤں ایک ساتھ دیکھی نہ جاسکے۔ ارضی تعلق اور علاقائی وابستگی کا جذبہ وفاداری کے احساس کو کتنا محدود کر دیتا ہے اس کا کچھ اندازہ ہم دلّی اور لکھنؤ سے قطعِ نظر ایک طرف یوپی، دلّی اور دوسری طرف پنجاب کے ادیبوں کی باہمی چشمک کے پس منظر میں بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ لینا کہ ایک خاص وضع کی تخلیقی حسیت صرف ایک ہی علاقے سے منسوب کی جاسکتی ہے، صحیح نہیں۔ مقامی روایات اور ترجیحات کے باعث تھوڑا بہت فرق تو ممکن ہے، لیکن عہدِ مصحفی کے لکھنوی اور دہلوی شعرا کے یہاں امتیاز و اختلاف کے ساتھ ساتھ مماثلت اور اشتراک کے ہزار پہلو بھی ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔ خود مصحفی کی شاعری بھی ایک معین دائرے کی شاعری نہیں ہے۔

اصل میں میرؔ، نظیرؔ اور سوداؔ کی طرح مصحفی بھی کلیات کے شاعر ہیں۔ اُن کی کائناتِ خیال میں میرؔ کی جیسی وسعت اور گہرائی تو نہیں، لیکن رنگارنگی کم نہیں ہے۔ وہ زندگی اور شعور کی کسی بھی سطح کو ہاتھ لگانے سے گھبراتے نہیں۔ کسی بھی تجزیے کو گرفت میں لینے سے شرماتے نہیں۔ فراق صاحب نے مصحفی پر اپنے معرکہ آرا مضمون میں بہت مرموز اور مبہم

طریقے سے اور شاعرانہ انداز میں میرؔ اور مصحفی کا موازنہ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''میرؔ و مصحفی میں وہی فرق ہے جو دوپہر اور غروبِ آفتاب کے وقت میں پایا جاتا ہے اور جس طرح شام کو آفتاب میں ساتوں رنگ جھلکنے لگتے ہیں، اسی طرح رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھرتی اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے، اگر ہم سنگیت کے استعارے کو کام میں لائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی کے نغموں میں وہی دل فریب کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو آواز میں پتّی لگ جانے سے پیدا ہوتی ہے''۔

مصحفی کے وہ اشعار جو میرؔ کی یاد دلاتے ہیں...... ان میں سے قریب قریب ہر شعر میرؔ کے اشعار کے مقابلے میں ہلکا ہے۔ لیکن ان دونوں میں وہی فرق ہے جو تیز اور میٹھے میٹھے درد میں پایا جاتا ہے۔

میرؔ کی جذباتی یا نفسیاتی انانیت مصحفی میں نہیں ہے، اس لیے مصحفی کے یہاں ایک رکی رکی سی معصوم حیرت، ایک دبی ہوئی بے چارگی کی مسکراہٹ، اوپر کے دانتوں سے نیچے کا ہونٹ دبا لینے کی ادا ملتی ہے''۔

(اندازے، ادارۂ انیس اردو، الٰہ آباد، ص: 33,32(1959))

گویا کہ مصحفی کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کرتے وقت، ان کے ساتھ ہمارا ذہن اٹھارویں صدی کے جن مشاہیر کی طرف جاتا ہے وہ میرؔ اور سوداؔ ہیں۔ افسر صدیقی امروہوی نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اپنی کتاب مصحفی، حیات وکلام (مکتبۂ نیا دور، کراچی، 1975) میں مصحفی کو میرؔ، سوداؔ، میر سوزؔ، غالبؔ، داغؔ، جرأتؔ، انشاؔ، شاہ نصیرؔ۔ سب کے ساتھ رکھ کر دیکھا ہے۔ اس کا جواز ان کے نزدیک یہ ہے کہ:

''شیخ مصحفی کی ہمہ گیر وہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہ کر کے مشاہیر شعرائے متقدمین ومتاخرین میں سے تقریباً ہر ایک کا اندازِ سخن کا

> پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ چناں چہ ان کی غزلوں میں کہیں میرؔ کا درد ہے تو کہیں سوداؔ کا دبدبہ، کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہ سوز کی سادگی۔ کہیں واقعات میں جرأت کی سلاست و حقیقت نگاری سے کام لیا ہے تو کہیں ترکیب الفاظ و اندازِ بیان میں انشا کا طنطنہ و جبروت صرف ہوا ہے۔ کہیں غزلوں کو واقعاتِ مسلسل پر ختم کرنے میں میرزا جعفر علی حسرت کا رنگِ کلام پیش نظر ہوتا ہے، تو کہیں مشکل مشکل ردیف قافیہ میں شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور جن غزلوں اور بیتوں میں اِن اساتذہ کی خوبیوں کو اُن کی کہنہ مشقی اور استادی یکجا کردیتی ہے، اُن کا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جاسکتا ہے۔'' بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ دورِ آخر کے اساتذہ غالبؔ و مومنؔ بلکہ داغؔ کی ساحرانہ خصوصیاتِ کلام کا بھی بیشتر رنگ اُن کے کلام میں موجود ہے اور جس طرح خواجہ حافظ شیرازی اپنی ہمہ گیری اور ہمہ رنگی کے باعث شعرائے فارسی میں بلبل شیراز کے بامعنی خطاب سے مخاطب ہیں، اسی طرح شیخ مرحوم کو اردو شعرا کے گروہ میں عندلیب ہزار داستان کا درجہ حاصل ہے۔　　(ص 190-191)

ظاہر ہے کہ مصحفی کے شعری مزاج اور مرتبے کی تفہیم میں اس طرح کا رویّہ جانبداری، جذباتیت اور مبالغے کے عناصر سے خالی نہیں، لیکن جس بنیادی اگرچہ ادھوری سچائی کی طرف اس بیان میں اشارہ کیا گیا ہے، اس کو نظرانداز کردینا بھی مصحفی کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ مصحفی کی مجموعی حیثیت کی تعمیر میں ان کی شاعری کے حجم اور اشعار کی کثرت کے علاوہ کچھ اور عناصر بھی ایک رول ادا کرتے ہیں۔ یوں تو تقریباً چالیس ہزار شعر کہہ لینا، بجائے خود، ایک کارنامہ ہے۔ پھر مصحفی نے تو اپنے اردو کلام (آٹھ دواوین) کے علاوہ فارسی میں بھی تین دیوان یادگار چھوڑے، غزل، قصیدے، مثنوی سے لے کر مسدس، مخمس،

رباعی، قطعے، سلام اور مراثی تک، کتنی صنعتوں میں اپنے آپ کو آزمایا، فارسی اور اردو شاعری کے تذکرے (عقدِ ثریا، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا) مرتب کیے، اپنے زمانے کے کئی باکمالوں کے شعور کی تربیت کی، سخن کے بہ ظاہر متضاد اور مختلف رنگ یکساں قدرت اور کامیابی کے ساتھ اختیار کیے، شعری اور فنی رموز و نکات پر جس انداز سے روشنی ڈالی، اس سے ایک بھری پڑی، سرگرم طبّاع اور علمی اوصاف سے مالا مال شخصیت کی تصویر بنتی ہے جسے ہم اردو شاعری کے اُس سب سے روشن اور متحرک دور میں کئی اعتبارات سے ممتاز دیکھتے ہیں۔ مصحفی کی ادبی شخصیت جتنی رنگارنگ اور وسیع ہے، اس کے پیش نظر، مصحفی کی پہچان بھی ایک کشادہ اور متنوع ادبی اور ذہنی سیاق میں کی جانی چاہیے۔ مصحفی کی شاعری اور شخصیت اٹھارویں اور اوائلِ انیسویں صدی کی سب سے بڑی شخصیتوں سے کندھا ملا کر چلتی ہے۔ اس ہجومِ ہنرمنداں میں وہ الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے ذرا دیر پہلے مصحفی کو کلیات کا شاعر جو کہا تھا تو اسی لیے کہ ان کی دنیا محدود نہیں ہے اور ان کی شخصیت کے حوالے ایک ساتھ بہت سے ہیں۔ تخلیقِ شعر کے مضمرات پر ان کی گرفت شاید اپنے سب سے معروف اور جلیل القدر معاصرین سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔ اسی لیے مصحفی چاہے جس طرح کا شعر کہیں، ایک خاص سطح سے نیچے وہ کبھی نہیں اترتے۔ مصحفی کے دیوان کی سیر اچھے برے، سنجیدہ اور ہنسوڑ، تفکر آمیز اور چلبلی طبیعتوں سے بھری ہوئی ایک جیتی جاگتی دنیا کی سیر ہے۔ مصحفی کے دور سے آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو یہ دنیا سمٹتی سکڑتی نظر آتی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اٹھارویں صدی کے اختتام تک، جس شعری روایت کا بول بالا تھا، وہ ایک نئی آگہی اور نئے دور کے ساتھ وجود پذیر ہونے والی روایتوں سے زیادہ آزاد، بے تکلف اور خود مختار تھی۔ اٹھارویں صدی کا ادبی معاشرہ، ہر طرح کے بیرونی اثرات سے بچا ہوا معاشرہ تھا جہاں صرف آزاد بندے بستے تھے اور اپنی من مانی کرتے تھے۔ چناں چہ میر، سودا، نظیر کی طرح مصحفی کے کلیات میں بھی ہمیں انسانی تجربوں اور احساسات کی تقریباً

تمام منطقوں کا سراغ ملتا ہے۔ بلندیاں اور پستیاں یہاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ جو مصحفی نے خود کہا ہے کہ:

آفتابِ زمیں ہوں میں لیکن
مجھ سے روشن ہے آسمانِ سخن

تو بلا وجہ نہیں کہا ہے۔ اُن کے افکار و احساسات کا اُجالا ہماری مادّی اور طبیعی دنیا سے مابعد الطبیعیات تک، دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مصحفی اپنے تجربوں کی جیتی جاگتی، ارضی اساس سے کبھی لاتعلق نہیں ہوتے۔ زمین کے جلوؤں کا اور جسمانی زندگی کے گرم اور رنگین تجربوں کا بیان وہ اسی دل جمعی کے ساتھ کرتے ہیں جس طرح فلسفہ و حکمت کی باتیں۔ رنگ اور روشنی کی ایک مسلسل بارش ہے جس میں مصحفی کی حسیّت شرابور نظر آتی ہے۔

ایک بجلی کی کوند ہم نے دیکھی
اور لوگ کہیں ہیں وہ بدن تھا

☆☆

جمنا میں کل نہا کے اس نے جو بال باندھے
ہم نے بھی جی میں اپنے کیا کیا خیال باندھے

☆☆

کون آیا تھا نہانے لطفِ بدن سے جس کی
لہروں سے سارا دریا آغوش ہوگیا تھا

☆☆

کیا عجب ہرگز ترے حسنِ سپید و سرخ سے
ہو گلابی پردۂ چشمِ تماشائی کا رنگ

☆☆

برق کی طرح جلا خاک کیا مزرع دل
کر گئی ہم سے یہ دھانی تری پوشاک ملوک

☆☆

اک شاخ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ
قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی

☆☆

آستیں اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح
آرہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

فراق صاحب کا خیال ہے کہ ''آج تک اردو کے کسی غزل گو کے کلام میں رنگ کا لفظ اتنی بار نہیں آیا ہے جتنی بار مصحفی کے یہاں آیا ہے''۔ واقعہ یہ ہے کہ مصحفی کے شعر میں جاہلی دور کے عربی شعرا کی طرح ان کی تمام حسیں ایک ساتھ بیدار نظر آتی ہیں یہ بہت بڑا وصف و امتیاز ہے مشرق کی شعری مزاج کا۔ وہ اپنے تجربوں کے بیان کی خاطر جو دنیا خلق کرتے ہیں وہاں روح اور جسم کی ثنویت ختم ہو جاتی ہے۔ ہم ایک جیتی جاگتی وحدت کا راگ سننے لگتے ہیں اور رگوں میں چہکتے بولتے لہو کی گونج۔ اٹھارویں صدی کی شعری روایت کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ اس کی گرفت میں آنے والی دنیا ایک اکائی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ میؔر سے مصحفی تک، سب سے اہم پہلوان کی حسیّت کا یہی ہے کہ وہ اپنے ہیجانات کی حقیقت کا شعور رکھتے ہیں۔ ان پر کوئی حکم نہیں لگاتے۔ اپنے حسّی، جذباتی اور اعصابی ارتعاشات کے معاملے میں بیباک دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے حسیّت کے حصے بخرے نہیں کرتے۔ بہت فطری، سادہ اور توانا ذہنی زندگی گزارتے ہیں۔ اپنے دل و دماغ، اپنی روح اور جسم کی پکار پر ایک سی توجہ کے ساتھ کان دھرتے ہیں۔ مصحفی کے کلیات میں احساس و افکار کی جو دنیائیں آباد ہیں، ان میں فرق تو ہے، لیکن یہ دنیائیں ایک

سلسلہ سا بناتی ہیں۔ ایک کے ہاتھوں دوسرے کی نفی نہیں ہوتی۔ تمام روزنوں سے ایک ہی چہرہ جھانکتا نظر آتا ہے، کبھی اداس، کبھی شادماں، کبھی متین اور متفکر، کبھی ہنسوڑ اور دل لگی باز، کبھی معنی آفریں، کبھی قافیہ پیما۔ مصحفی ہر حال میں صاف پہچانے جاتے ہیں۔ نورالحسن نقوی کا خیال ہے کہ ''چونکا دینے والی ردیفیں، نامانوس قافیے، مشکل بحریں، ثقیل الفاظ، حسینوں کے لباس اور آرایش کا ذکر، بوس و کنار کے مضامین...... یہ مصحفی کا اپنا رنگ نہیں تھا، لکھنؤ میں قدم جمانے کے لیے ناچار اختیار کیا تھا''۔

(انتخاب کلام مصحفی، ناشر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 2000)

ظاہر ہے کہ طبیعی اور جغرافیائی حالات بدلتے ہیں تو شخصی سوانح اور تاریخ کی نوعیّتوں اور آثار میں بھی کسی نہ کسی حد تک تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ چناں چہ لکھنؤ میں بودوباش اختیار کرنے کے بعد وہاں کی فضا کا کچھ نہ کچھ اثر مصحفی تو مصحفی، انیس کے گھرانے نے بھی قبول کرلیا تھا، لیکن مصحفی کی شاعری کی اس پہلو کا جائزہ لیتے وقت ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ذہنی اور جذباتی آمادگی کے بغیر کسی نامانوس رنگ کو اپنا لینا بہرحال، آسان نہیں ہوتا۔ میر صاحب لکھنؤ میں اقامت کے باوجود لکھنؤ کے عام رنگ سے الگ رہے اور کوئی ایسی روش انھوں نے اختیار نہیں کی جوان کے مذاق و مزاج سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔ مصحفی نے ''خارجیت'' کے عناصر سے اپنی شاعری کو آراستہ کرنے کے باوجود، اپنی انفرادیت کا تحفظ کیا اور خارجیت کے عناصر و اسالیب جس حد تک قبول کیے، اس کی مثالیں ہمیں دہلوی شعرا کے یہاں بھی مل جاتی ہیں۔ مصحفی کی استادانہ مہارت اور مشاقی اس نئے رنگ کو برتنے کا حوصلہ اور ہنر بھی رکھتی تھی۔ فراق صاحب کا خیال ہے کہ ''تقلید و انتخابیت کے باوجود بھی مصحفی، مصحفی رہتا ہے۔ اس کے بہروپ میں بھی اس کا اصل روپ نظر آتا ہے''۔ (اندازے، ص 77) اب سوال یہ ہے کہ مصحفی کا اصل روپ کیا ہے؟ ہر باکمال شاعر کی طرح مصحفی کے کلیات میں بھی طرح طرح کے تجربوں اور اسالیب کی ایک بھیڑ دکھائی دیتی

ہے۔ اسی بھیڑ میں مصحفی کا وہ چہرہ بھی شامل ہے جو حیات و کائنات کے بنیادی سوالوں کا سامنا کرنے سے کتراتا نہیں اور اپنی حسیّت کا اظہار اس گہری اور گمبھیر سطح پر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے جو ہمیں میؔر کے نشتروں سے ملتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

اب مری بات جو مانے تو نہ لے عشق کا نام
تو نے دکھ اے دلِ ناکام بہت سا پایا

☆☆

غم نہیں قیدِ قفس کا ہمیں اتنا صیاد
پر یہ حسرت ہے کہ یوں ہم سے گلستاں چھوٹا

☆☆

سوئے جو اب کے تان کے چادر کو منھ پہ ہم
اے مصحفی کسی سے جگایا نہ جائے گا

☆☆

شاید آیا ہے اسیروں میں کوئی تازہ اسیر
اس قدر شور نہ تھا خانۂ زنداں میں کبھی

☆☆

کیا تماشا ہے تہہِ خاک یہ معلوم نہیں
چشمِ نرگس کو اُدھر ہی نگراں دیکھا ہے

☆☆

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

☆☆

دکھلا نہ روئے صبحِ وطن خواب میں ابھی
قصہ تمام شامِ غریباں نہ کر مرا

☆☆

بہ رنگِ مہر نہ پست و بلندِ دہر پہ جا
نہ یاں کمال کی مدت، نہ کچھ زوال کی عمر

☆☆

کیا خاک کوئی شاد ہو، اس باغ میں ہرگز
غنچے کو تبسم کی بھی فرصت نہیں ملتی

☆☆

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

☆☆

اے وائے کہ سو کام ہیں درپیش ہمارے
اور عمر کی فرصت ہے سو اک آدھ گھڑی ہے

☆☆

مت میرے رنگِ زرد کا چرچا کرو کہ ہاں
رنگ ایک سا کسی کا ہمیشہ نہیں رہا

☆☆

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

اس طرح کے شعروں میں مصحفی، میر اور سودا کے ہم زبان دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں

نے چھوٹی بحروں میں جو شعر کہے ہیں، ان میں یہ انداز اور زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے۔ وہی معصومانہ تغزل، سادگی اور جذباتی خلوص جو میرؔ اور دردؔ کا ترکہ تھا، مصحفی کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں جا بجا ملتا ہے۔ میرؔ اور غالبؔ کے یہاں چھوٹی بحروں کے استعمال کا تجزیہ کرتے ہوئے عسکری صاحب نے لکھا تھا کہ ''چھوٹی بحر کی حیثیت گویا ایک کسوٹی کی سی رہی ہے جس سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ شاعر کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل ہے اور جس تجربے کا اظہار مقصود ہے، اس پر پورا قابو ہے یا نہیں''۔ (تخلیقی عمل اور اسلوب، ناشر، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1989) اس سلسلے میں عسکری صاحب نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ چھوٹی بحر کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ تجربات کا خلاصہ پیش کیا جائے۔ یعنی یہ کہ چھوٹی بحر کا شعر تجربے کے ارتکاز اور اظہار و بیان کے ایجاز کے لحاظ سے صرف انہی شاعروں کی گرفت میں آتا ہے جو گہری انتخابی نظر رکھتے ہوں اور اپنے احساسات کی تفصیل میں جائے بغیر بھی اپنی بصیرت کے انکشاف کا سلیقہ رکھتے ہوں۔ اس میدان میں مصحفی ہمیں میر، درد، قائم اور غالب کی صف کے شاعر نظر آتے ہیں۔ سرگوشی، خود کلامی اور دوستانہ مکالمے کا ایسا جادو بھرا انداز اردو غزل کی روایت میں بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔ یہ کچھ مثالیں دیکھیے:

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

☆☆

جس کو ہم روزِ ہجر سمجھتے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

☆☆

میں خستہ تمام ہو چکا اب
جا درد کہ کام ہو چکا اب

☆☆

در گزرے ہم ایسی زندگی سے
دنیا میں اگر فراغ ہے یہ

☆☆

نخوت سے جو کوئی پیش آیا
کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی

☆☆

اس میکدۂ جہاں میں یارو
مجھ سا بھی کوئی خراب کیا ہے

☆☆

جو بلا آسماں سے آئی ہے
ہم نے وہ اپنی جان پر لی ہے

☆☆

آخرِ عمر اپنی نظروں میں
جامۂ زندگی کہن سا لگا

☆☆

شب ہجر صحرائے ظلمات نکلی
میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی

☆☆

مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

☆☆

کہہ دے کوئی جا کے مصحفی سے
ہوتی ہے بری یہ چاہ ظالم

☆☆

یاد ایام بے قراریٔ دل
وہ بھی یا رب عجب زمانہ تھا

☆☆

حیران ہے کس کا جو سمندر
مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے

ان اشعار میں وہی دل سوزی اور ملائمت، وہی آزمودہ کاری اور اعتماد ہے جو سہل ممتنع کا بنیادی وصف ہے، یہ اشعار ضرب المثل کی طرح زبان پر آسانی سے چڑھ جاتے ہیں۔ ان میں زبان و بیان کا لطف بھی ہے اور رکھ رکھاؤ بھی۔ ایک رچا ہوا آہنگ اور مشکل سے ہاتھ آنے والی سادگی انھیں صرف شاعری نہیں رہنے دیتی، انھیں روشن بصیرتوں کا مرقّع بھی بنا دیتی ہے۔ اس طرح کے شعروں میں ایک انفرادی کیفیت ہے۔ ایک گہرا احساس شناسائی، مانوسیت اور اشتراک کا ایک خاموش عنصر اس طرح کے شعروں کی وساطت سے ہمیں مصحفی کی منفرد اور نجی شاعرانہ شخصیت تک لے جاتا ہے۔ ان شعروں میں ہمیں ایک جانی پہچانی، ہمارے احساسات کو سنبھالنے اور سہارا دینے والی گھریلو فضا ملتی ہے۔ تحت بیانی کے انداز سے رونما ہونے والی ایک بے نام سی کیفیت، مصحفی کے کلام میں اُن سے ہمارے قریب آنے، بے تکلف ہو جانے اور اُن کی آگہی پر بھروسہ کر لینے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔ اسی کیفیت کو فراقؔ صاحب نے مصحفی کے انداز کی نجی شخصیت کا نام دیا ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ مصحفی ہمیں ہجوم میں منفرد، اپنی بزم میں تنہا اور اپنے ہم عصروں میں سب سے مختلف

دکھائی دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے ''آتش کے زمانے میں ناسخ کو صرف رسماً اور تعظیماً غزل گو ماننے'' کی بات کہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مصحفی کے کلام کو بھی اگر ان کے سب سے معروف ہم عصر اور حریف انشا کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو میر، سودا، درد اور قائم کے فوراً بعد آراستہ ہونے والی محفلِ شعر میں مصحفی ہی بڑی حد تک اکیلے شاعر ٹھہرتے ہیں اور (جرأت کے ہوتے ہوئے بھی) مصحفی کا شعر اس دور کی شاعری کا سب سے روشن اور منفرد حرفِ اعتبار۔

الف

(آغاز دیوانِ ہشتم بسببِ انتقال نمودنِ مصنف ناتمام ماندہ است)

1

صحراے[1] محبت سے اُٹھا تھا جو بگولا　　اس خاک کی ہے شان ظلوماً و جہولا
داغِ دلِ خوں گشتہ سے پنجہ جو ملاتا　　ایسا تو کوئی لالہ گلستاں میں نہ پھولا
میرٹھ کے کسیرو کا میں دلدادہ نہ کیوں ہوں　　پیارا نہ لگے کیوں کے ہو جو طفل جھنڈولا
آنسو نہیں گرتے ہیں مری چشم سے لمبے　　برسات میں ڈالا ہے اِن آنکھوں نے یہ جھولا
نقشا نہ کبھی صورتِ نوعی کا مٹے گا　　نجّار کے ہے ہاتھ میں جب تک کہ بُسولا
یوں ہیئتِ مجموعی مرے عشق کی ہے داغ　　جس طرح کہ آتش میں جلے ہے کبھی پُولا
بن تیرے تصور کے مری زیست ہو کیوں کر　　صورت سے جدا بھی کہیں ہوتا ہے ہیولا
رٹ نام کی تیرے نہ گئی دھیان سے میرے　　میں تا دمِ آخر بھی صنم تجھ کو نہ بھولا
عیار تھا میں بھی، دلِ گم گشتہ کی اُس پر　　اوپر کی ڈری؟ چوری جو پکڑی تو قبولا
پوشیدہ ہیں باطن میں مرے عیب ہزاروں　　ہر چند میں ظاہر میں تو لنگڑا ہوں نہ لُولا

اے مصحفی نامرد مگر سمجھی وہ مجھ کو
ہاتھی شبِ ہجراں نے طرف میری جو ہولا

1۔ اصل میں اسی طرح ہے۔

2

عشق کرتا ہوں میں معشوق سے دانائی کا — سوچ رہتا ہے مجھے اُس کی بھی رسوائی کا

کوئی آئینے کو خلوت میں نہ لاؤ میری — تا نہ مٹ جائے مزا عالمِ تنہائی کا

عشق کے نام سے اب اشک ٹپک پڑتے ہیں — تھا کبھی حوصلہ ہم کو بھی شکیبائی کا

لڑکے مجنوں کے تئیں مارے ہیں پتھرے یعنی — شہر میں کام ہے کیا مردمِ صحرائی کا

پور پور اُنگلیوں میں پہنے ہیں اُس نے چھلّے — اس قدر شوق ہوا ہے اُسے زیبائی کا

لی خبر تو نے نہ پھر در پہ بٹھا کر مجھ کو — ہوں میں دیوانہ پری رو تری چترائی کا

کچھ تو دیکھی ہے زمانے سے اذیّت اُس نے — گوشہ عنقا کو خوش آیا ہے جو تنہائی کا

رات دن شہر کی گلیوں میں پڑے پھرتے تھے — عشق تھا جب کہ ہمیں اُس بتِ ہرجائی کا

اُس کی مجلس میں، میں آئینہ بنا ہوں جا کر — دم سبھی بھرتے ہیں واں میری شناسائی کا

حسن کا اپنے وہ دیکھے ہے تماشا اُس میں — آئینہ سامنے ہے چشمِ تماشائی کا

کُھل گئی شاہدِ حی پر، دلِ مجنوں کی جلن[1] — خون نکلا جو سیہ فصد میں سودائی کا

سبزہ رنگوں سے مجھے مصحفی کچھ کام نہیں
ہوں میں دیوانہ ولے سبزۂ صحرائی کا

3

یکا یک کوہِ آفت کب مرے سر پر نہیں آتا — بُرا دن بھی جو آتا ہے تو وہ کہہ کر نہیں آتا

زمینِ باغ میں شاید[2] ہیں کتنے تشنہ لب مدفوں — کہ جو گُل واں سے آتا ہے تو بے ساغر نہیں آتا

گریبانِ کفن میں چاک جو ہیں، اِس خجالت سے — جنازے پر مرے ادریس پیغمبر نہیں آتا

وہ کیا جانے کسی کو ذبح کرنا، طفلِ ناداں ہے — ابھی تو ہاتھ میں لینا اُسے خنجر نہیں آتا

کہیں ہیں یار نے تیرے کیا ہے یارِ نو پیدا — یہ سچ یا جھوٹھ ہو لیکن مجھے باور نہیں آتا

1۔ اصل: چلن (سہو کتابت) 2۔ اصل: شاہد ہیں کتنے (قیاسی تصحیح کی گئی)۔

سبک وضعوں کو لے جاتا ہے سیلِ فتنہ ہر جانب — کہیں پانی میں تو بہتا ہوا پتھر نہیں آتا
رکھے ہے اور ہمسایوں پر منت کیا بُری خو ہے — کہ میرے گھر کبھی مہماں مرا دلبر نہیں آتا
تکے ہیں راہ سب اُس کے ہی آنے کی، سبب کیا ہے — کہ وہ برہم زنِ ہنگامۂ محشر نہیں آتا
لگے رہتے ہیں دائیں بائیں عاشق گھات میں اس کی — شب تاریک میں وہ بھول کر تا دَر نہیں آتا
کھڑے ہم در پر اُس کے گالیاں غیروں کی کھاتے ہیں — وہ اندر گھر کے سنتا ہے کھڑا، باہر نہیں آتا
جو محبوب القلوبِ گل رُخاں تھا زندگانی میں — زیارت کو اب اُس کی اک پری پیکر نہیں آتا
لگا ہے وصل کا مرہم، رہا ہے چور کیا اُس میں — ہمارا زخمِ دل کس واسطے پھر بھر نہیں آتا
کہاں جاوے وہ بے چارہ مصیبت تو بڑی یہ ہے — مسیحا کو علاجِ عاشقِ مضطر نہیں آتا

کئی دن مصحفی میں رُک رہا تو جی میں وہ بولا
اُسے درپیش کیا آیا، جو وہ لاغر نہیں آتا

4

جس کے ناسورِ کہن پر سالہا مرہم لگا — آج اُس بیمار کو کہتے ہیں اُلٹا دم لگا
اک گھڑی اک پل نہیں چت سے اترتی اس کی شکل — اس دلِ بے غم کو میرے ہائے کیسا غم لگا
یہ وہی سروِ رواں ہے فتنہ و آشوبِ شہر — سایہ ساں پھرتا ہے جس کے پیچھے اک عالم لگا
تجھ کو جب کاجل لگاتے عکس نے کی آنکھ تلخ — آئنہ نظروں میں مجھ کو اس گھڑی کیا سم لگا

جلد جانے کا ارادہ مصحفی یاں سے کیا
محفلِ ہستی میں ہم آئے تو، پر دل کم لگا

5

لکھے ہیں خط تو بہت، نامہ بر نہیں ملتا — تمام شہر میں قاصد کا گھر نہیں ملتا
ربودگی ہے یہ کس تیغ کی خدا جانے — جو اپنے دوش پہ عاشق کا سر نہیں ملتا
یہ قحطِ نامہ براں ہے کہ شہرِ عشق کے بیچ — جو ڈھونڈیے تو کبوتر کا پَر نہیں ملتا

کہا جو میں نے اُسے جان تک ادھر آ تو　خفا ہے یار اسی بات پر، نہیں ملتا
عدم میں جاکے میں ڈھونڈوں گا خوب سا اُس کو　وجود میں تو نشانِ کمر نہیں ملتا
مگر ہے یار کا دل ملتفت بہ جانبِ غیر　مزا جو گریہ میں اے چشمِ تر! نہیں ملتا
میانِ قافلہ لیلیٰ ہے اور مجنوں بھی　جو راست پُوچھو تو ایسا سفر نہیں ملتا
پھرے ہے آہ مری ڈھونڈتی فلک پر اُسے　چھپا ہے ایسا کہ مطلق اثر نہیں ملتا
نہ تربیت پہ کمینے کی عمر ضائع کر　کہ شاخِ بید سے ہرگز ثمر نہیں ملتا
کہاں تلک کوئی صدمہ اُٹھائے رنجش کے　مزاج یار کا دو دو پہر نہیں ملتا
پٹک کے سر کو نہ رہ جاویں کیوں اسیر اُس کے　فلک کے گنبدِ بے در کا در نہیں ملتا

سبب ہے کیا وہ کدھر چھپ رہا ہے ان روزوں
جو ہم سے مصحفیِ بے خبر نہیں ملتا

6

جو دال چنے کی پہ لکھے پیل کا خاکا　ناخن پہ نہ کھینچے وہ گراں ڈیل کا خاکا
آجائے جو وسعت پہ ابھی خامۂ مانی　قطرہ میں دکھاوے وہ شطِ نیل کا خاکا
دیمک نے جو چاٹے ہیں مرے شعر کے کاغذ　ہر صفحہ محرّم کی ہے قندیل کا خاکا
مفہوم ہو کیا تجھ کو مری صورتِ عقلی　دیکھا ہے کسی شخص نے جبریل کا خاکا
خطِّ سیۂ عارضِ جاناں نے دکھایا　خورشید کے صفحے پہ ابابیل کا خاکا
نیلِ نظرِ بد تو نہ ہو اے بُتِ کافر　ہے گورے بدن پر جو ترے نیل کا خاکا
لے جائے جو مدرک کوئی بے معنی کو اُس کے　اب تک تو مٹا بھی نہیں انجیل کا خاکا
نا مرد دل اُس کو بھی کلاں باز ہی سمجھا　تصویروں میں آیا جو نظر چیل کا خاکا
سبزے سے زمیں سبز ہو جس دشت کی یکسر　واں چاہیے اشکوں کی مرے جھیل کا خاکا
غرقاب ہوا نیل میں سب عالمِ سفلی　کُھلی تھا مگر اُس کی سراویل کا خاکا

انگشت بھی رکھتا ہے وہ سوزن سی مژہ کا کھینچے ہے پر پشہ پہ جو پیل کا خاکا
اے مصحفی شاعر وہ نہیں ہے جو نہ کھینچے
شعروں میں افاعیل و تفاعیل کا خاکا

7

جن تربتوں پہ تھا نہ کبھی جوشِ نقشِ پا عشرت میں سب وہ ہوگئیں گلپوشِ نقشِ پا
جس خاکِ رہ کو ہو نہ ترا ہوشِ نقشِ پا اس پر قدم رکھے تری پاپوشِ نقشِ پا
واماندگاں کی بانگِ جرس خود دلیل ہے جرم اُس کا کیا ہے گر نہ سنے گوشِ نقشِ پا
پانو نے تیرے کیا نہ کیا اُس کو سرفراز حلقے کی آرزو میں تو تھا گوشِ نقشِ پا
کیا کیا صفِ نعال میں مٹی[1] ہیں صورتیں اک اہلِ بزم کو یہ نہیں ہوشِ نقشِ پا
گر ہے کفک پہ اور یہ پنجے پہ پاشنہ اغلب کہ بول اُٹھیں لبِ خاموشِ نقشِ پا
مدفوں ہیں جو کنارے پہ رستے کے اُن کی خاک کھینچے نہ کیوں کے حسرتِ آغوشِ نقشِ پا
ہر ہر قدم پہ مرگ کا جن کو خیال ہے رکھتے ہیں وہ جنازہ سر دوشِ نقشِ پا
مستانہ وار قیسِ حزیں کی خرام تھی ناقے کے پیچھے تھا جو قدح نوشِ نقشِ پا
کیا اعتماد ہستی فانی کا مصحفی
ہے بے ثبات مثلِ تن و توشِ نقشِ پا

8

چنداں بہ رنگِ گُل چمنِ دہر میں رہا کب میں تو شام و صبح ترے قہر میں رہا
لیلٰی کی زلف ہوگئی زنجیر پاے عقل مجنوں رفیق تھا جو مرا شہر میں رہا
آتے ہی وے کے نخلِ چمن خشک ہوگئے پانی نہ حوض میں، نہ کسی نہر میں رہا
جس دن سے چِت چڑھی مرے زنجیرِ مارِ زلف اُس دن سے کچھ جنوں ہی کی میں لہر میں رہا
جیتا نہ پھر بچے گا کوئی اُس کا نیچہ دو چار دن جو اور پڑا زہر میں رہا

1۔ اصل: بیٹھی؟

قاصد نے میرے آپ کو ناحق کیا ہلاک　　اک دم کہیں وہ بیٹھ نہ دو پہر میں رہا

جب مصحفی نے لولیِ دنیا کو دی طلاق
باقی نہ اُس کا ایک درم مُہر میں رہا

9

ہنگامہ بانکپن سے ترے شہر میں رہا　　مارا گیا کوئی تو کوئی قہر میں رہا

اُس تازہ گُل کے ابرۂ فرغل کے واسطے　　استر شفق کا شب کو پڑا ڈھیر میں رہا

شیریں لبوں نے منھ کو لیا ہم سے جب چھٹا　　کیا خاک زندگی کا مزہ دہر میں رہا

محرم کو اُس کے دیکھ کے شب محوِ آئنہ　　گوٹے، بنتِ حباب[1] میں اور لہر میں رہا

زاہد کو تو نہ ماہیِ مطلب ہوئی شکار　　بگلا یہ سر جھکائے بہت نہر میں رہا

بل بے شب وصال کی بد اختلاطیاں　　کیا پوچھتے ہو مجھ سے میں جس قہر میں رہا

یوں زہرمُہرے ہاتھ لگے کتنے مصحفی
دیکھا نہ وہ میں حسرتِ فازہر میں رہا

10

مت اُربسی کی شکل دل آذر کا گھر بنا　　مثلِ شرر تو رہنے کو پتھر کا گھر بنا

سینہ میں میرے سیکڑوں پھڑکے ہیں حسرتیں　　سینہ نہ یہ ہوا کہ کبوتر کا گھر بنا

سقف و جدار مانعِ نظارہ تا نہ ہوں　　معمار جلد مت مرے دلبر کا گھر بنا

باقی رہا تھا پوست جو تیرے مریض میں　　صرفِ نیام ہو کے وہ خنجر کا گھر بنا

مژگاں کو گردِ چشم تری دیکھ میں کہا　　نرگس کا پھول سیکڑوں نشتر کا گھر بنا

پایا نہ جب جہاں کی عمارات کو ثبات　　آخر بہ زیرِ خاک سکندر کا گھر بنا

رہنا ہی جب نصیب نہ ہو اس میں مصحفی
کس کام کا جو عاشقِ مضطر کا گھر بنا

1۔ اہلِ نظر کی صلاح سے یہ قرأت متعین کی گئی۔ گوٹا، بنت (نقرئی بیل) ''حباب'' لہر (بانک) بیل اور لچکے کے قبیل کی آرائشی اشیا ہیں۔

11

دلِ نو رستہ کو میرے مُضر ہے گریہ ہر پَل کا کرم کلّے کو پانی زہر ہو جس طرح بادل کا
خدا کے ساتھ بندہ بن کے اُس کے نورِ وحدت نے دکھایا کتنے اندھوں کو تماشا چشمِ احول کا
اُسے فرشِ نہالی پر بھلا کس طرح نیند آوے خلش کرتا ہو جس نازک بدن کو خواب مخمل کا
جو ہیں صاحب کمال ان کو نہیں کچھ پیر کی حاجت ہوا آئینۂ خورشید کب محتاج صیقل کا
حباب اُس دلبرِ نازک بدن پر صدقے جاتا ہے پہنتا ہے وہ کُرتا جس گھڑی باریک ململ کا
کمر کا پیچ میں احوال کیا ہو میں بھی حیراں ہوں ترازو ہو رہا ہے بوجھ ان کولھوں پہ ہیکل کا
منبت ہو گیا خورشیدِ تاباں اس پری رو کی[1] برہمن نے دیا چھاپا جبیں پر جوں ہی صندل کا
ثریّا کا شفق میں مصحفی عالم دکھاتا ہے
لگانا وہ سندوری قشقے پر اُس بت کے کاجل کا

12

ہر ایک سے کھینچو ہو کیوں آپ کو دور اتنا کچھ خوب نہیں صاحب! دولت پہ غرور اتنا
سرگوشی کے کرتے ہی وہ آگ بگولا تھا خدمت میں ہوا اُس کی ہاں مجھ سے قصور اتنا
دلّی کے پری پیکر، ہیں زور پری پیکر کس واسطے نازاں ہے رعنائی پہ حور اتنا
کیا جامِ تہی سے تو ڈھکائے ہے، اے ساقی! گو مست ہوں میں لیکن ہے مجھ کو شعور اتنا
شاید کسی دشمن نے کچھ کان میں پھونکا ہے آگے تو نہ تھا مجھ سے وہ شوخ نفور اتنا
میں سیرِ عدم کرتا ہستی میں بھی آ نکلا یاں گرچہ نہ تھا مجھ کو کچھ کام ضرور اتنا
ہم بھی تو تمھارے تھے ہم جلسۂ کہیں روزوں کیوں بھول گئے ہم کو، اے اہلِ قبور اتنا
کی مصحفی نے پروا ہرگز نہ امیروں کی
ہم نے تو کوئی شاعر دیکھا نہ غیور اتنا

1۔ اصل۔ نے

13

راہِ طلب میں سعی سے غافل کہاں ہوا　کوچیں[1] کٹیں تو گھٹنوں کے بل میں رواں ہوا
تنگی میں رشکِ غنچۂ گل وہ دہاں ہوا　مسّی ملی تو اور بھی کافر دھواں ہوا
مجنوں کے دل میں دل کی رہی ایک دم کبھو　لیلیٰ کے ناقے سے نہ جدا ساربان ہوا
جوہر دکھائے سب دلِ بیتاب نے مرے　زنگِ شتر بنا، جرسِ کارواں ہوا
مرغانِ میوہ خوار کی ہم جنس میں نہ تھے　دشمن ہماری جان کا کیوں باغباں ہوا
زلف و کمر کے قصے میں دل جا پھنسا دریغ　اس بے گنہ کا مفت میں خوں درمیاں ہوا
سچ ہے ہزار پردوں میں چھپتا نہیں ہے عشق　جتنا نہاں کیا اسے اُتنا عیاں ہوا
کچھ نوچا باغبان نے تو کچھ لے گئی صبا　گلشن میں یوں خراب مرا آشیاں ہوا
خط یار کو جو ہم نے لکھا شوقِ وصل میں　جب تہ کیا تو رشکِ خطِ تو اماں ہوا
اُس مو کمر کی یاد میں سوکھا میں یہ کہ ہائے　نالِ قلم کی تشکل ہر اک استخواں ہوا
سوسن سے باج لیوے گا حسنِ ملیح میں　شبّو کا پھول اُس کا اگر سرمہ داں ہوا
جھنجھلا کے میں بھی بوسہ دلیرانہ لے گیا　جب گالیوں سے بند نہ اُس کا دہاں ہوا
نفرت ہے کس قدر تمھیں عاشق سے واچھڑے　بھاگے وونہی جو غیر سے خالی مکاں ہوا
رکھتا ہے سوزِ دل کی خبر سب کے شعلہ رو　بے ہودہ، اے سپند تو گرمِ فغاں ہوا

کیا اب کے شاعروں میں تری قدر مصحفی
مانا میں یہ تو افصح ہندوستاں ہوا

14

سامری گرچہ نہ موسیٰ کے جدل میں چوکا　لیکن اعجاز سے کچھ چل نہ سکا جادو کا
آنکھ جس وقت کہ کر لیتے ہیں ہم اپنی بند　نظر آجائے ہے آبادی میں عالم ہوٗ کا
صورتِ چشم اگر پائی ہے بادام نے تو　برگِ بادام بھی خاکا ہے ترے ابرو کا

1۔ اصل: کوچہ

ایسے قاتل سے اماں کیونکہ نہ مانگے عاشق سر بریدہ کو وہ تکیہ جو کرے زانو کا
جن کے دیدار سے ہوتی ہے خوشی عالم کو کیا مہِ عید بھی جوشن ہے ترے بازو کا
دیکھ اُس پھول کو لالے کے اُسے آیا غش جس میں کچھ رنگ نکلتا تھا مرے لوہو کا
تاک اینڈے ہے بہت اپنے سرو سایہ پر اُس نے دیکھا نہیں اُلجھاؤ ترے گیسو کا
گلبدن تک نہیں یاں آنکھوں میں کچھ رکھتا قدر خلق اِتراتی ہے پاجامہ پہن کتنو کا
مصحفی اُس نے مرے ہاتھ سے پانی نہ پیا
ناگہاں اُس کو بہانا جو ہوا اُچھّو کا

15

خط پہ کاجل کی مژہ ہندسہ ہے جادو کا شوخیِ چشم نے باندھا ہے طلسم آہو کا
دیدۂ حسن پرستی سے جو دیکھے مجنوں بید کی شاخ میں بھی نکلے ہے خم ابرو کا
کچھ طرف اُس کی ہی ہر لحظہ ڈھلا جائے ہے یہ تکیہ دیکھا ہے مرے سر نے مگر زانو کا
اُس کی آنکھوں نے زبس میری طرفداری کی سی دیا سوزنِ مژگاں سے دہن بدگو کا
مصحفی یار مِلا مجھ سے کئی بار ولے
ہاتھ آیا نہ مرے وقت کوئی قابو کا

16

ایک دن رنگا جو اُس نے زنگار میں دوپٹا بھیجا پری نے اپنا بازار میں دوپٹا
لاہی مگر کرے گا خورشید بیچنے کو لگ جائے شاید اُس کی سرکار میں دوپٹا
ہے آبشار اب تک پتھر سے سر پٹکتی اوڑھا تھا کس نے سادہ گلزار میں دوپٹا
جوشِ عرق جو یہ ہے تو اُس بدن سے لگ کر موتی پرو رہے گا ہر تار میں دوپٹا
آزادہ مشتری کو شیخی سے کام کیا ہے آیا ہے یاں حسابِ دستار میں دوپٹا
یہ جو ہے شیر اک دن جاں کوہکن کی لے گی تانے گا سر پہ اپنے کہسار میں دوپٹا
سو پیچ تاب دل میں گزرے ہیں جب سے دیکھا لپٹا ہوا میانِ دلدار میں دوپٹا

رونے پہ گر ہم آئے بہتا پھرے گا تیرا اے ابرِ تر چمن کے جو سار میں دوپٹا
وہ رتھ نشیں غضب ہیں یارو جو چلمنوں کے اندر سے تان لیویں دیوار میں دوپٹا
ڈھائی پٹا نہ اوڑھے وہ مصحفی تو کیا غم
دو پاٹ کا تو ہووے مقدار میں دوپٹا

17

رہتا ہے خوش اب اپنی اوقات میں دوپٹا کب سے تری کمر کی تھا گھات میں دوپٹا
ہے جائے رشک یارو! یہ ظلم کیونکہ دیکھوں شفتالو رنگ لپٹے اُس گات میں دوپٹا
اوقات یوں کٹے ہے بیمارِ غم کی تیرے سو بار منھ پہ لینا دن رات میں دوپٹا
عاشق کے سوکھے دھانوں پانی پڑا اُسی دم اُوڑھا جو اُس نے دھانی برسات میں دوپٹا
سالو کی ساری ہے واں یا ڈوریے کی چادر رکھتا ہے قدر یکسر میوات میں دوپٹا
اے مصحفی وہ کافر از بس بنارسی تھا
بھجوایا اُس نے ہم کو سوغات میں دوپٹا

18

گھر سے باہر جو میں خو کردۂ زنداں نہ گیا فصلِ گل میں بھی کبھی سوئے گلستاں نہ گیا
ارمغاں گل کی کلی کوئی تو لائی ہے صبا تا چمن نالۂ پُر دردِ اسیران نہ گیا
رات مجھ سے جو تصوّر نے تیرے شوخی کی صبح تک دھیان ترا، اے گلِ خنداں نہ گیا
انتخابِ دلِ عاشق کا میں دیوانہ ہوں درد کو چھوڑ کے ہرگز سوئے درماں نہ گیا
وہ فراموشِ جہاں تھا کہ پس از مرگ مرے لبِ افسوس کسی کا تہِ دنداں نہ گیا
ضعفِ دل سے جو کمی آگئی گریے میں مرے قطرۂ اشک کبھی تا بُنِ مژگاں نہ گیا
چمنِ دہر نہ تھا جائے اقامت، اس سے کون سا گل کہ بہ صد حسرت و حرماں نہ گیا
گھر سے نکلا تو صنم عید کی قربانی کو مجھ سے تقصیر ہوئی، میں ترے قرباں نہ گیا

وصل کی شب بھی لڑائی ہی رہی یار کے ساتھ
سر سے عاشق کے عذابِ شبِ ہجراں نہ گیا

قسمیں کھائیں میں بہت پاک محبت کی و لے
چور جو دل میں ترے تھا کسی عنواں نہ گیا

اُس نے پائی نہ پھبن تیری خوش اندامی کی
سرو قد پر ترے، اے سروِ خراماں نہ گیا

مرگ پر بستہ کمر ہو کے چلا جو دلِ زار
اُس کے پیچھے کوئی تا کوچۂ جاناں نہ گیا

سمجھا میں اپنا کفن جامۂ عریانی کو
مجھ سا دنیا سے کوئی بے سروساماں نہ گیا

اُس نے چاہا تھا بہت کھینچ مجھے جھٹکے دے
ہاتھ میں اُس کے و لے میرا گریباں نہ گیا

تھا میں مردودِ جہاں، ہمرہِ تابوت مرے
تا لبِ گور کوئی گبر و مسلماں نہ گیا

دیر تک سانپ نے بانبی سے نکل سر پٹکا
اُس سے سودا ترا، اے جعد پریشاں! نہ گیا

اپنے گریہ میں بھی نکلے ہے خوشی کا عالم
کون سا اشک بہ نوکِ مژہ رقصاں نہ گیا

مصحفی پوچھ نہ افلاس کا میرے باعث
تھا میں مغرور کبھی تا درِ سلطاں نہ گیا

19

پھر یہ کیسا اُدھیڑ بُن سا لگا
جانِ غم دیدہ کو جو گُھن سا لگا

اُس گلی میں جو میں اُٹھا گاہے
پائے خوابیدہ مجھ کو سُن سا لگا

اُس نے جس وقت اور سر کھینچا
نخلِ قد اُس کا سرو بُن سا لگا

اُس کے چھلّے کے ہیں جو گُل کھائے
داغ ہر اک، بدن پہ ہُن سا لگا

آخرِ عمر اپنی نظروں میں
جامۂ زندگی کہن سا لگا

کشتی چشمِ تر کھنچی ہے اُدھر
ہے جدھر تارِ اشک گُن سا لگا

یارِ دھرماتما کا پیار کے ساتھ
بوسہ دینا بھی مجھ کو پُن سا لگا

جب دلِ سوختہ پہ زخمِ مژہ
نظر آیا وہ صاف پُن سا لگا

میں سنا مصحفی کو پیری میں
مجھ کو خیلے وہ خوش سخن سا لگا

20

باتوں پہ لگاوٹ کی مری یار نہ ٹھہرا — اک دن بھی شبِ وصل کا اقرار نہ ٹھہرا
گُل تکیہ جب اُس کے تہِ رخسار نہ ٹھہرا — آرام سے تکیہ پہ سرِ یار نہ ٹھہرا
جب چھوڑے ہی پیچھا نہ یہ آزارِ محبت — اک روگ ہوا جان کو آزار نہ ٹھہرا
ہر روز کیا عہد تو ہر روز وہ توڑا — اک وعدے پہ سچّا بُتِ عیار نہ ٹھہرا
تصویرِ خیالی کے تری، خواب میں میں نے — سو بوسے لیے تو بھی گنہ گار نہ ٹھہرا
مضمونِ قلق تھا جو خطِ شوق میں میرے — بازو پہ کبوتر کے وہ زنہار نہ ٹھہرا
اُڑ اُڑ گئے سب سوے چمن، کہنہ قفس میں — آخر کو کوئی مرغِ گرفتار نہ ٹھہرا
للکارا میں شانے کو جو اُس زلف میں جاتے — تھا چور وہ، پانْو اُس کا شبِ تار نہ ٹھہرا
دوڑا تھا ہوا خواہی کی کچھ بات میں کہنے — رستے میں پر اُس گُل کا ہَوادار نہ ٹھہرا
دیکھا جو مجھے وادیِ تجرید کا سالک — گُل ایک طرف پاس میرے خار نہ ٹھہرا
از بس کہ کرم اس پہ ہوا دستِ جنوں کا — آخر کو گریبان میں اک تار نہ ٹھہرا
تاراج فلک دشمن خوبانِ جہاں ہے — پھولوں کا ہَوا میں کبھی انبار نہ ٹھہرا
جب صحبتِ معشوق سے حاصل ہوئی راحت — دلدار ہوا پھر وہ دل آزار نہ ٹھہرا
دِق جس کے تئیں تیری جدائی میں ہوئی تھی — تدبیریں بہت کیں پہ وہ بیمار نہ ٹھہرا
نزدیک اطبّاء کے ترے خستہ جگر کا — جُز داغ علاجِ دلِ بیمار نہ ٹھہرا
کس رنگِ شکستہ کا اشارا تھا چمن میں — تا دیر جو رنگِ رخِ گلزار نہ ٹھہرا
کوچے میں ترے بارشِ پیکانِ بلا ہے — اک دم کے سوا سایۂ دیوار نہ ٹھہرا

کل آتے ہی مجلس میں گیا بھانپ وہ سب کو
نظروں میں مگر مصحفیِ زار نہ ٹھہرا

21

تماشا تا سحر دیکھا کروں تا سیرِ کوکب کا — اشارا مجھ کو کرتا ہے فلک بیداریِ شب کا

غزالوں میں لگے ہے دل بہت مجنوں کا ان روزوں مگر ملتا ہے کچھ اُن میں مزا لیلیٰ کے مکتب کا

خدایا جلد دلبر سے مرے مجھ کو ملا ورنہ فلک حامل نہ ہووے گا مری فریاد یا رب کا

کبودی گاہ مسّی کی، گہے پانو کی سرخی ہے عقیقِ سادہ نے عالم کہاں پایا ترے لب کا

نماز و روزہ کی میرے ہے کیوں پرسش فقیہوں کو میں ہوں وارستہ کچھ اتنا نہیں پابند مذہب کا

زبس ترسان و لرزاں ہی رہے ہم یار کی خو سے نہ پایا اس تقرّب پر کبھی ڈھب عرضِ مطلب کا

مزے میں اب تلک بیٹھا میں اپنے ہونٹھ چاٹوں ہوں لیا تھا خواب میں بوسہ جو یک شب سیبِ غبغب کا

وزیر و شاہ سے یوں حق جو کچھ چاہے دلا دیوے مقیّد ورنہ بندہ تو نہیں کچھ جاہ و منصب کا

سخن سے تیرے بوے بادہ آئی مصحفی مجھ کو
خدا جانے کہ دُردی کش ہے تو کس رند مشرب کا

22

کل پتنگ اُس نے جو بازار سے منگوا بھیجا سادہ مانجھے کا اُسے ماہ نے گولا بھیجا

نام کا اُس کے جو میں کہہ کے معمّا بھیجا یہ بھی حرکت ہے بُری اُس نے یہ[1] فرما بھیجا

اُس کی فرمایشیں کیا کیا نہ بجا لایا میں کبھی پتّا کبھی لچکا، کبھی گوٹا بھیجا

قیس و فرہاد کو جاگیر یہی عشق نے دی ایک کو کوہ ملا، ایک کو صحرا بھیجا

سوزن و شانہ و آئینہ خریدے ہم نے کبھی بھیجا بھی تو اُس گل کو یہ سودا بھیجا

پھر تہِ خاک مرا داغِ جگر تازہ ہوا کس نے تربت پہ مری لالۂ حمرا بھیجا

عاشقوں میں اُسے گنتے نہیں وارستہ مزاج جس نے تا نوکِ قلم حرفِ تمنّا بھیجا

داغِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، دردِ فراق حضرتِ عشق نے کیا کیا ہمیں تحفا بھیجا

مصحفی جا کے وہاں بھول گئے کیا ہم کو
کبھی یارانِ عدم نے جو نہ پُرزا بھیجا

1۔ اصل: نہ

23

پریشاں کیوں نہ ہو جاوے نظارا　اس آرایش نے دل پر نقش مارا

یہ مشاطہ بلاے تازہ لائی　مجعد کر دیا سر اُس کا سارا

ہزاروں چوٹیاں نتھی تھیں اور بال　نہ کیوں تخت اپنا لٹوا دے ہزارا

گداز آہن دلوں کو حسن جب دے　نہ ہووے آب کیونکر سنگِ خارا

کہیں دیکھا ہے اس ہیئت کا معشوق　نظر کیجو مسلماناں! خدا را

بلے اے مصحفی دیگر چہ گویم
ادائے موے مانی کشتہ مارا

24

دل رہا مشتاق ہی اُس شخ کماں کے تیر کا　خوں زمینِ کعبہ پر بہتا نہیں نخچیر کا

عذر خواہی شخصِ ظالم کی نہیں ہرگز قبول　پیشِ پاے شمع سر پھیروں رہے گل گیر کا

سوے صحرا خاک میں جاؤں کہ تجھ بن طرفِ باغ　بید کے پتّے کا ہلنا وار ہے شمشیر کا

درگزر کی میری آہِ صبح گاہی نے بہت　آسماں کے اور مرے تھا ورنہ پلّا تیر کا

ہوں میں اُس چاہت بھری خوباں کی مجلس کا جلیس　دل جہاں لگ جائے ہے تصویر سے تصویر کا

حسنِ صورت ہے رخِ معنی سے ازبس جلوہ گر　ہر ورق دیواں کا میرے ہے ورق تصویر کا

قتل گاہِ ناز میں تو اتنی رخصت ہی نہیں　خونِ بسمل لے سکے بوسہ لبِ شمشیر کا

کیا مگر مجنونِ شیدا نجد سے آیا کہیں　کوچۂ لیلیٰ میں پھر کچھ شور ہے زنجیر کا

اہلِ معنی کشتنی ہیں، اہلِ صورت بے زوال
مصحفی ہے تیغ سے بے غم قلم تصویر کا

25

چھپ گیا جلوہ دکھا وہ بُتِ پُرفن اپنا　نیم نظارہ ہوا جان کا دشمن اپنا

زوٹ مارے وہ گیا ایسی روش سے کہ مجھے — پھر کے منھ بھی نہ دکھایا دمِ رفتن اپنا
کام کیا ہے، یہ نہیں چاہتی ہمت ہرگز — غیر کے گھر سے دِیا کیجیے روشن اپنا
عشوۂ لولیِ دنیا ہے فریبندۂ دل — یہی خطرہ ہے کہ ڈگ جائے نہ آسن اپنا
مسی آلودہ لبوں پر ہے غضب سرخیِ پاں — خون پیتی ہے جسے دیکھ کے سوسن اپنا
تا رہے حسرتِ نظارہ، ذرا عاشق کو — جلوہ دکھلاتے ہو تم چھوڑ کے چلمن اپنا
کس کے دیوانوں کی زنجیریں گھڑی جاتی ہیں — کچھ گراں بیچیں ہیں حداد جو آہن اپنا
تیری عصمت میں ہمیں شک نہیں، اے مایۂ ناز! — پر کریں کیا جو نہ سمجھے دلِ بدظن اپنا
رخ تلک جاوے نظر زلف سے بچ کر کیونکر — ایک مدت ہوئی یہ مار ہے رہزن اپنا
خاکِ آغشتہ بخوں کو مری بے قدر نہ جان — گل بدن سارے اسے کرتے ہیں اُبٹن اپنا
شکر مر کر بھی نہ منت کشِ احباب ہوئے — لالۂ داغِ جگر ہے گلِ مدفن اپنا
خاک میں کیا اُنھیں آنا نہیں، بے رحمانہ — میری تربت پہ کُداتے ہیں جو توسن اپنا
ربط کیا رکھے ہے اُس چاند سے مکھڑے سے نگاہ — جاوے کچھ فکر کرے دیدۂ روزن اپنا
اشک بے خواست جو آنکھوں سے چلے آتے ہیں — منھ پہ پہروں ہی رہا کرتا ہے دامن اپنا

مصحفی سایہ بھی واں آنکھ نہیں رکھ سکتا
ہے جہاں وادیِ تجرید میں مسکن اپنا

26

شب پیشِ نظر حسن کا بازار تو رکھا — کھٹمل کا میں ممنوں ہوں کہ بیدار تو رکھا
کیا چاہے ہے اب اور تو کہہ، اے بُتِ کافر! — عاشق کو جدائی نے تری مار تو رکھا
صیاد کی مجرم ہوئی اس امر میں بلبل — تیلی پہ قفس کی سرِ منقار تو رکھا
عاشق کی پس از مرگ برآئی یہ تمنا — اُس بُت کے ہی اس کو پسِ دیوار تو رکھا
ڈھے جانے کا کچھ گھر کے مجھے غم نہیں اتنا — اس خانہ خرابی نے ہوادار تو رکھا
اک خط نہ پڑا نازکیِ دست سے، اُس نے — خنجر کو گلے پر مرے سو بار تو رکھا

تھوڑا ہے، میں عاشق نہ ہوا اور کسی پر ہجراں میں بھی اس سے ہی سروکار تو رکھا
کیا خاک سلوک اور کرے دردِ محبت اس درد نے برسوں مجھے بیمار تو رکھا
گو وہ نہ ملا آکے تو کچھ غم نہیں اتنا نظروں میں سدا وصل کا اقرار تو رکھا
گر تیر نہ پھینکا مری جانب تُو ہوا کیا دیکھ اُس نے مجھے، فاق پہ سوفار تو رکھا
مژگاں کا تری کشتۂ احساں ہوں نہ کیونکر تربت پہ مری گل کی جگہ خار تو رکھا

اوروں سے نہ بولا تو نہ بولا وہ پر اُس نے
تھوڑا سا دلِ مصحفیِ زار تو رکھا

27

دنیا کے بیچ مجھ پہ جو رنج و عذاب تھا جب آنکھ کھل گئی تو یہ دیکھا کہ خواب تھا
اپنا طلسمِ زندگیِ بے ثبات، آہ! یوں مٹ گیا، کہے تُو، طلسمِ حباب تھا
بل بے فروغِ حسن کہ عہدِ شباب میں ہر نقشِ پا زمیں پہ ترا آفتاب تھا
سب کہتے ہیں کہ رستے میں مارا پڑا غریب قاصد کے پاس کیا مرے خط کا جواب تھا؟
بزمِ چمن تھی بزمِ مئے لالہ گوں جو رات ہر برگِ گل کے ہاتھ میں جامِ شراب تھا
ہر چند میری آنکھ تو تجھ پر پڑی نہ تھی میں ڈر گیا کہ چہرہ ترا بے نقاب تھا
دعوت میں شب کی بے مزہ وہ شرمگیں گیا ہم جانتے ہیں بے نمک اپنا کباب تھا
سمجھے تھے ہم تو چشمۂ آب اس کو دور سے دیکھا جو پاس جا کے تو عالم سراب تھا
آغاز اُن دنوں تھا کہولت کا اپنی آہ! اے شوخ! جن دنوں ترا جوشِ شباب تھا
میں نالہ کر شب اُس کی گلی سے جو اُٹھ چلا ق ہر ہر قدم پہ دیدۂ گریاں سے آب تھا

کہنے لگا کہ ''سب جسے کہتے ہیں مصحفی
میں جانتا ہوں یہ وہی خانہ خراب تھا''

28

شانے میں گیسوؤں کا ترے خم نکل گیا اتنی ہی کشمکش میں مرا دم نکل گیا

اے گریہ! لاکھ جان سے ممنون ہوں ترا البتہ کچھ تو دل کا مرے غم نکل گیا
آبادی لکھنؤ کی نہ اگلی سی رہ گئی عالم ہوا تباہ تو عالم نکل گیا
تیزی ہوا کی دیکھیو پتی سے گل کی صبح پیکاں کی طرح قطرۂ شبنم نکل گیا
میں بھر دیا تھا اس کے تئیں زخمِ تیر میں گرمی جو پائی موم نے مرہم نکل گیا
ہم روئے بس کہ خوب سا سن سن کے مرثیہ دل کا بخار ماہِ محرم نکل گیا
وا ہی تو نکلنے کا اُس کے سبب ہوئی کیا اپنے بس بہشت سے آدم نکل گیا
سناٹا سا نسیم کا تھا کیا وہ مصحفی
جلد ایسا جو بہار کا موسم نکل گیا

29

آغازِ سال، ماہِ محرم سے ہووے گا رتبہ مرا حسینؓ کے ماتم سے ہووے گا
جب دل بتنگ اپنا صنم غم سے ہووے گا کر گزریں گے وہ ہم بھی جو کچھ ہم سے ہووے گا
اس روئے خی فشاں کا چمن میں مقابلہ کیا فائدہ ہے کب گل و شبنم سے ہووے گا
شوہر کرے گی اپنا وہ دیور جسیم کو یہ تو کبھی نہ حضرتِ مریم سے ہووے گا
عالم سے جان کا نہ خطر کر کہ بعدِ مرگ تو واں دو چار قدس کے عالم سے ہووے گا
شیرین و شور کا جو مزہ چاہتا ہے تو وہ تجھ پہ منکشف چہہِ زمزم سے ہووے گا
کہنے لگا یہ زخم مرا دیکھ کر مسیح کچھ فائدہ نہ اس کو تو مرہم سے ہووے گا
فکرِ سخن، تلاشِ معاش و خیالِ یار غم کم ہوا تو ہاں دلِ بے غم سے ہووے گا
اب تو پڑی ہے پیری میں اپنی ہی مصحفی
ہم آپ میں رہیں گے تو سب ہم سے ہووے گا

30

مژدۂ آمدِ گل سن نہ میں تنہا اُچھلا دیکھ سبزے کو ہر اک آہوئے صحرا اُچھلا
اس میں گرداب سے گرداب ہیں کچھ کیا کہیے نہ کبھی چاہِ ذقن کا ترے ڈوبا اُچھلا

خواہشِ وصل کا مضموں جو کسی سطر میں تھا   کیا کہوں خط کو مرے پڑھ کے وہ کیا کیا اُچھلا
کیا مزہ اس کے دمِ تیغ میں ہے کیا جانے   آج تک ایک بھی بسمل جو نہ تڑپا اُچھلا
کشتۂ فندقِ پا کی تری تربت سے رات   ایک فوارۂ خوں تا بہ ثریا اُچھلا
صاف بجلی سی گئی کوند تمامی کی سنجاف   دامن انداز سے ٹھوکر کی جو اُس کا اُچھلا
دست و پا مارتے کیا خاک کہ بحرِ غم میں   ہم جہاں ڈوبے تھے پانی نہ وہاں کا اُچھلا
سن کے داغِ دلِ سوزاں کا مرے حال سپند   رات مجمر میں بہت رشک سے کودا اُچھلا
خال و خط دیکھ کے بگڑا جو مزاجِ عاشق   پتّی اچھلی کبھی اُس کے کبھی سودا اُچھلا
برق کی جست مری آہِ فلک سیر میں ہے   یوں کہاں آتشِ سوزاں سے پتنگا اُچھلا
قلزمِ عشق کے پیراک سبھی ڈوب گئے   ان سے اُچھلا بھی تو شاید کوئی برلا اُچھلا

مصحفی کی جو غزل گائی کہیں مطرب نے
شیخ ہو دست فشاں وجد میں آیا اُچھلا

31

قدم اُٹھے نہ پئے سیر بے دماغوں کا   نہ جنگلوں کا ارادہ، نہ قصد باغوں کا
نہ میری قبر پہ ہو روشنی پس از مردن   کہ بے دماغ کرے گا دھواں چراغوں کا
زبس کہ عشقِ پری طلعتاں میں گل کھائے   بنایا پہنچے کو گلدستہ میں نے داغوں کا
شکستِ جنس کو لازم پڑی ہے نوحہ گری   کہ مردہ زاغ پہ ہوتا ہے شور زاغوں کا
یہ کب خیال میں لاتے ہیں تاجِ شاہی کو   دماغ عرش پہ ہے تیرے کم دماغوں کا

دماغِ مصحفی ان روزوں کیوں نہ عرش پہ جائے
ہوا ہے شوق اُسے خردنوں کے باغوں کا

32

رخ زلف میں بے نقاب دیکھا   میں تیرہ شب آفتاب دیکھا

محروم ہے نامہ دارِ دنیا پانی سے تہی[1] حباب دیکھا
سرخی سے ترے لبوں کی ہم نے آتش کو میانِ آب دیکھا
قاصد کا سر آیا اُس گلی سے نامے کا مرے جواب دیکھا؟
جانا یہ ہم نے وفات کے بعد دیکھا جو جہاں میں خواب دیکھا
آفت کا نشانہ ہو چکا تھا میں دل کی طرف شتاب دیکھا
اک وضع نہیں مزاجِ معشوق گہ لطف و گہے عتاب دیکھا
آنکھوں سے بہاریں گزریں کیا کیا کس کس کا نہ میں شباب دیکھا
کل میکدے میں بغیرِ ساقی اوندھا قدحِ شراب دیکھا
کیں اس نے جفائیں بے حسابی اک دن نہ کبھو حساب دیکھا
سینے سے نکل پڑا نہ آخر دل کا مرے اضطراب دیکھا
کیا ہوگی فلاح بعدِ مردن جیتے تو سدا عذاب دیکھا
آبادی ہے اس کی مصحفی کم
عالم کے تئیں خراب دیکھا

33

بلبلو! باغباں کو کیوں چھیڑا تم نے سازِ فغاں کو کیوں چھیڑا
مجھ کو اُس تُرک سے یہ شکوہ ہے دل پہ رکھ کر سناں کو کیوں چھیڑا
نہ بلا لائے مجھ سا دیوانہ سنگسارِ جہاں کو کیوں چھیڑا
اے ہُما! اور کھانے تجھے بھر دے میرے ہی استخواں کو کیوں چھیڑا
بہلہ نادم ہو جی میں کہتا ہے میں نے اُس مومیاں کو کیوں چھیڑا
پھر گیا مجھ سے جو مزاج اُس کا گردشِ آسماں کو کیوں چھیڑا
دور سے اُس نے میری صورت دیکھ توسنِ خوش عناں کو کیوں چھیڑا

1۔ اصل: تبھی

داستاں اپنی مجھ کو کہنی تھی قصۂ این و آں کو کیوں چھیڑا
قصہ خواں! اور لاکھ قصے تھے تو نے ذکرِ بُتاں کو کیوں چھیڑا
جس سے کل مجھ کو آگئی تھی غشی پھر اُسی داستاں کو کیوں چھیڑا
مصحفی گھر کے گھر جلا دے گا
ایسے آتش زباں کو کیوں چھیڑا

34

ہے نورِ ماہ سے روشن چراغِ گور مرا عجب نہیں جو مجاور بنے چکور مرا
تو گوشِ دل سے سنے اس کو گر بتِ بے مہر! فسانہ طرفہ ہے اور ماجرا ہے زور مرا
کہوں ہوں میں لبِ شیریں کی اس کے وصف سدا قلم نہ کیونکہ بنے نیشکر کی پور مرا
گلے لگا تھا شہیدوں کے میں جو وقتِ وداع اُنھوں کے خون میں کرتا ہے شور بور مرا
وہ نالہ کش میں نہیں جس کی ہو صدا ہلکی برنگِ چنگ گیا آسماں پہ شور مرا
ہزار رنگ کے کھائے ہیں میں نے تن پہ جو گل ہزار چشم سے حیراں رہا ہے مور مرا
چکئی پھراتے میں دیکھا تھا مصحفی اُس کو
ہنوز دل ہے برہمن پسر پہ ڈور مرا

35

ہوا ہے ڈوروں پہ فندق کی دل جو ڈور مرا سبب یہی ہے کہ دزدِ حنا ہے چور مرا
میں داغِ دل کو رکھوں ہوں عزیز اس خاطر کہ بعدِ مرگ بنے گا چراغِ گور مرا
گیا ہوں باغِ جہاں سے میں مثلِ موجِ نسیم کہ تا نہ کر سکے پیچھا کوئی لگور مرا
خیالِ موے میاں میں ہوا ہوں جو لاغر بنا ہے جادہ خط نقش پائے مور مرا
نہ ہو اسیر وہ رنگیں مزاج طائر ہوں نہ تا کہ دام ہو گلزار جی سے تور مرا
میں آفتاب سے کھاتا ہوں روز انگارے عجب نہیں ہے اگر منھ لگے چکور مرا
نماز پڑھتے یہ پٹکا ہے سر کو پتھر پر کہ میرے خوں میں ہے عمامہ شور بور مرا

چُرا کے آنکھ جو گزرے ہے سامنے سے مرے
میں جانتا ہوں کہ وہ مصحفی ہے چور مرا

36

روزِ اول سے تو صورت میں فلک کانا تھا　شب کو کیا دیدۂ انجم اسے چمکانا تھا
درد پہلو کا ہوا اور فزوں، آہ مسیح!　تجھ کو پہلو سے مرے تکیہ نہ سرکانا تھا
تیغ ابرو کا تری جس نے لیا تھا بوسہ　اس کا سر کاٹ کے دروازے پہ لٹکانا تھا
خواب میں شاہدِ گل کے خلل آیا دمِ صبح　باغباں! باغ میں کھٹکے کو نہ کھٹکانا تھا
خوابِ مخموری کا عاشق سے بہانہ ہے عبث　لے کے انگرائیاں چولی اُسے مسکانا تھا
اونچی بن کے وہ شب بام پہ آیا اپنے　غالباً تُرکِ فلک کو اُسے دھمکانا تھا
اتنی بے شرم و حیا ہوگئی کیوں دخترِ رز　آنکھیں بازار میں یوں اُس کو نہ مٹکانا تھا
چینِ ابرو نے طرف مانگ کی جانے نہ دیا　کیا مرے دل کو رہِ راست سے بھٹکانا تھا
جانبِ کعبہ تو کیوں لے گیا بُت خانے سے　مجھ سے دیوانے کو، اے عشق! نہ بہکانا تھا
سخت آوارہ و سرگشتہ ہے مجنوں، لیلیٰ!　جستجو میں اُسے اتنا بھی نہ بہکانا تھا

میں بھی، اے مصحفی! مابین قلم پھر رکھا
برج[1] معنی کے میں مجھ کو جو یہی گانا تھا

37

یوں ہوا ہجر کی شب مجھ سے مرا یار جدا　جان جوں نزع کے دم تن سے ہو ناچار جدا
بانکپن خوب نہیں اتنا، ٹھہریے کوئی دم　پرتلے سے تو ذرا کیجیے تلوار جدا
تنگ و تاریک کوئی حجرہ بنا دو مجھ کو　کہ اسیروں سے رہے گا یہ گنہگار جدا
نملی اور نہ دودی ہے، نہ منشاری ہے　نبضِ بیمارِ محبت کی ہے رفتار جدا
پہلوے قیس میں لے جا کے مجھے دفن کرو　مقبروں سے ہے عزیزوں کے یہ ہڑاور جدا

1۔ چھتیس راگنیوں میں سے ایک راگ کا نام ہے۔ (فرہنگ آصفیہ)

اپنے سینے کا اُسے ان نے نگہباں سمجھا وصل کی شب بھی گلے سے نہ کیا ہار جدا
بس کہ تھی بیع و شرا حشر کے ہنگامے میں ہوگیا مجھ سے مرا دل سرِ بازار جدا
کبکِ کوہی کو بھلا کچھ بھی ہے تجھ سے نسبت اُس کی رفتار جدا ہے، تری رفتار جدا
حلقۂ زلف کوئی دامِ بلا ہے جس میں دل گرفتار جدا، دیدہ گرفتار جدا
پشت خط کو تو ذرا نامے کی میرے پڑھیے اُس میں مضمون تمنا کے ہیں دو چار جدا
جنس اچھی پہ نہ کس طرح لڑائی ہووے میں خریدار جدا، غیر گرفتار جدا
برگ گل میں لبِ شیریں کا جو پایا ہے مزہ گل سے کرتی نہیں بلبل سرِ منقار جدا
یوں جو چاہے تو گلا تیغ تلے رکھ میرا اُسترے سے تو نہ کر سبزۂ رخسار جدا
بے زری میں مرے قبضے سے گئی وہ ابرو ترکِ مفلس کرے جس طرح کہ تلوار جدا
اک تو در پر کھڑے رہنے سے ترے ہوں میں ملول جی کڑھاتے ہیں ترے رخنۂ دیوار جدا

مصحفی نزع میں ہوں اور نہیں کوئی شریک
کیا برے وقت ہوئے ہیں مرے غم خوار جدا

38

میں شبِ وصل جو اس شوخ کو مل دل ڈالا شرم سے اُس نے وو ں ہی چہرے پہ آنچل ڈالا
سادہ وضعی میں کٹی عمر بتِ کافر کی چین ابرو میں، نہ کاکل میں کبھی بل ڈالا
شوخ دیدہ ہیں صنم اور بھی تو مجھ کو بتا کس نے آنکھوں میں اس انداز سے کاجل ڈالا
جو نخود وار دلِ جمع رکھیں تھے ان کو چرخ کی چکی نے دانے کی طرح دَل ڈالا
کشتنی اور بھی آئے تھے بہت میداں میں خون اپنا میں تری تیغ پہ اول ڈالا
یہ نہ تھا قید سے واقف، دلِ ناداں کو مرے تو نے کس پیچ میں، اے زلف مسلسل! ڈالا

مصحفی میرے دلِ نرم کو اس نے شبِ عید
ہاتھ میں لیتے ہی مہندی کی طرح مل ڈالا

39

آب کی طرح زمیں پر ہے اجارا اپنا جوں سمندر نہیں ملتا ہے کنارا اپنا
آمد آمد ہی میں اُس تُرکِ جفا پیشہ کی رات عقل کھسکنت ہوئی، صبر سدھارا اپنا
چشمِ بیمار تری رکھتی ہے بیمار ہمیں تب تو آتا نہیں قوت پہ ستارا اپنا
کیا تری سوزنِ مژگاں کے چڑھا تھا منھ پر سینہ صد رخنہ جو رکھتا ہے ہزارا اپنا
ہاتھ سے اس کے نہ آئینہ جدا ہوسکتا میری آنکھوں سے جو کرتا وہ نظارا اپنا
راہ طے کی ہے شجاعت سے دمِ آخر لیک منزلِ مرگ میں، میں جی نہیں ہارا اپنا
ہم نے سو بار نگاہوں میں بلایا اس کو دور تھا بس کہ نہ سمجھا وہ اشارا اپنا
شعلۂ آتشِ سوزاں ہیں ہمیں کم نہ سمجھ پنجہ خورشید سے کرتا ہے شرارا اپنا
بازو و دست کو قاتل کے عبث ایذا دی ہاتھ سے اپنے میں کیوں سر نہ اُتارا اپنا
ہے غلط کاریِ رستم سے مجھے سخت ملال یوں کسی باپ نے بیٹا نہیں مارا اپنا
نہیں بیکار شبِ ہجر میں آمد شدِ دم زخمۂ ناز سے بجتا ہے دو تارا اپنا
ہم کو خواہش نہ ہوئی تیغِ خراسانی کی دل ترے ابروے خم دار پہ وارا اپنا
اتنے بے وزن نہیں ہم تو پس از کشتن بھی گر کوئی تولے اسے خون ہے پارا اپنا
مصحفی ہے یہ زمیں ریختۂ کلکِ نصیر
کوئی بیگانہ ہی بولا نہ پکارا اپنا

40

دامن کو لے کے منھ پہ وہ محبوب سو رہا بس اس کے خوابِ ناز میں یاں کام ہو رہا
میں مارے بدگمانی کے یاں ہوگیا ہلاک قاصد جو اس کی بزم میں شب ایک دو رہا
اے وائے یہ بھی کام تو پورا نہ کرسکی یک چند ہم کو حوصلۂ صبر گو رہا
کیا کیا شبِ وصال نہ لوٹوں گا میں مزے اُس کے گلے کا ہار مرا ہاتھ جو رہا

کہتے نہ تھے کہ عشق نہ کر اُس کا مصحفی
آخر تو اپنی جان کو، کم بخت کھو رہا

41

کل تو کھیلے تھا وہ گُلّی ڈنڈا ڈنڈ پیل آج ہو گیا سنڈا
لال کرتا ہے عشق عاشق کو آگ میں جیسے سرخ ہو کنڈا
دل ہے یوں زخم دارِ ڈاس فلک جیسے ہوتا ہے مچھلی کا کھنڈا
سب میں مشہور ہے شجاعتِ مرغ باہ افزوں کرے نہ کیوں انڈا
قلعۂ چرخ پر شبِ ہجراں جا کے گاڑا ہے آہ نے جھنڈا
مصحفی غم میں اس سہی قد کے ق سوکھ کر ہوگیا ہے سرکنڈا
حکم ہے مفلسی کا مفلس کو
شام سے تو چراغ کر ٹھنڈا

ب

42

دے تیرگیِ بخت سراغِ شبِ مہتاب لے جاؤں نہ تا گور میں داغِ شبِ مہتاب
کوتاہیِ بخت اپنی سے معشوق نہ آیا گر ہاتھ لگی ہم کو فراغِ شبِ مہتاب
کیا چاندنی میں ہم کو بھلے لگتے ہیں تارے یارب نہ خزاں ہووے یہ باغِ شبِ مہتاب
میں نور میں نالاں ہوں سیہ بختی سے اپنی چلائے ہے جس طرح کہ زاغِ شبِ مہتاب
جگنو کی چمک دیکھ کے کوٹوں نہ میں سینہ بل بے شرر افروزیِ زاغِ شبِ مہتاب
دے جامِ بلوریں میں مجھے بادہ تو ساقی! بے رنگ ہی بہتر ہے ایاغِ شبِ مہتاب

منھ کھول دیا اُس نے جو شب بام پر آ کر — پھر اُٹھ نہ سکا ہم سے دماغِ شبِ مہتاب
خط لکھنے کو درکار ہے کیا روشنیِ شمع — آزادوں کو کافی ہے چراغِ شبِ مہتاب
کیا زندگیِ پیر کا دنیا میں بھروسا — ہے صبح کے نزدیک چراغِ شبِ مہتاب

پھیلا کے نہ کیوں پانو کو اب مصحفی سووے
چادر میں کفن کی ہے[1] فراغِ شب مہتاب

43

رکھیں[2] ہیں جی میں مگر مجھ سے بدگمانی آپ — جو میرے ہاتھ سے پیتے نہیں ہیں پانی آپ
گھڑی گھڑی نہ کریں ہم پہ مہربانی آپ — کہ حسن رکھتے ہیں اور عالمِ جوانی آپ
میں بوسہ لے لے کے رخ کا اُٹھا دیا پردہ — اسی غرور پہ کرتے تھے لن ترانی آپ
میں اپنا حال جو کہنے لگا تو یوں بولا — "سنے ہے کون؟ کہا کیجیے کہانی آپ"
میں بے گناہ سزاوار گالیوں کے نہیں — نہ میرے ساتھ کریں اتنی بدزبانی آپ
مصوروں نے قلم رکھ دیے ہیں ہاتھوں سے — بناویں آئنے میں اپنا نقشِ ثانی آپ
وفا کی اس سے طلب کر نہ ہرگز، اے ناداں! — کہ بے وفا ہے طلسمِ جہانِ فانی آپ
شرابِ وصل کا کس کی پیا ہے یہ ساغر — خمارِ شب سے جو رکھتے ہیں سرگرانی آپ

یہ بے وفا بھی میاں مصحفی کسی کے ہوئے
بتوں پہ کرتے ہو کیوں اتنی جانفشانی آپ

44

کام میں اپنے ظہورِ حق ہے آپ — حضرتِ آدم کے تو ماں تھی نہ باپ

1۔ اصل: ہیں   2۔ اصل: رکھے

ان کو دے کچھ، مت ظرافت ان سے کر لے نہ، اے ناداں! اتیتوں کے شراپ
ہم تہی دستی میں بھی کچھ کم نہیں ہاتھ میں راجا کے ہو سونے کی چھاپ
آہ و نالے کا سمجھ ٹک زیر و بم سخت مشکل ان سُروں کی ہے الاپ
ہر کوئی چاہے گا اپنی مغفرت حشر میں سب کو پڑے گی آپا دھاپ
مصحفی مت اُس کے کوچے سے نکل
جب تلک دم ہے زمیں تو واں کی ناپ

ت

45

جاویں، کیوں ہم اُس کے پیچھے گو پھرے در در بسنت
گیندے اور گیہوں کی بالوں سے ہے اپنے گھر بسنت

اُس کے جاتے ہی گئی آنکھوں تلے سرسوں سی پھول
دے گیا داغِ جدائی لالے کے دل پر بسنت

ہر طرف تختے کے تختے زرد آتے ہیں نظر
بو گیا تھا کیا زمینِ باغ میں کیسر بسنت

جو کھلاتا ہے کلی لالے کی گیندے کے قریب
رکھے تھا[1] میرے دلِ صد چاک پر اخگر بسنت

سب طرح کے پھول گڑووں میں کیے ہیں مجتمع
یک چمن منت رکھے مردم کے تا سر پر بسنت

1۔ اصل: رکھتی تھی

زردیِ رخ کا جو تھا اندیشہ اُس کو عاقبت
پی گیا لالے سے لے کر خون کا ساغر بسنت

ہے گٹھی صحبت بہم لالے سے نافرمان کی
تو بھی سوسن سے ملا اپنے گلِ اصفر بسنت

دردمندوں کے دل و جاں میں بہ تکلیفِ بہار
مارتا ہے سبزۂ نوخیز سے نشتر بسنت

مصحفی ہے تو بھی اقلیمِ سخن کا بادشاہ
کیوں نہ آوے ہو کے مجرائی ترے در پر بسنت

46

لبِ شیریں ہیں تیرے آبِ حیات — اور دنداں بہ از سپید نبات
تیری خدمت میں یہ رہے مصروف — دن کو دن جانا اور نہ رات کو رات
نام جس کا ہے دل پہ پہلوے چپ — قطرۂ خوں ہے مبدء آفات
ابرِ رحمت! ترے ترشح بن — ہم کو خشکی میں کٹتی ہے برسات
گر دو رخ یار کے بہم ہوویں — مہر و مہ کی ہو وہیں بازی مات
چرخ صندوقچہ فرنگ کا ہے — جس کو آتی نہیں ہے کرنی بات
داغ دل کی ہے جدائی کا — یاد آتی ہے سیرِ بارہ وفات
کتنا ہے یار شرگیں موٹھاں[1] ؟ — جس کو آتی نہیں ہے کرنی بات
اُس کے سینے پہ پڑھیے کیوں نہ درود — ہم نے دیکھی نہ یہ پری کی گات
دھینگا مشتی میں ہاتھ سے میرے — دامنِ یار چھٹ گیا ہیہات
مصحفی عالمِ توکل میں — ق کیا کہیں کیونکہ کٹتی ہے اوقات

1۔ موٹھاں= منھاں، جس کا منھ ڈھکا رہا ہو۔

حامیِ بندہ ہم نے تو دیکھی
زیست اور موت میں خدا کی ذات

47

خوش کمر پھرتے ہیں گلیوں میں جو شمشیر سمیت — ہم بھی ساتھ ان کے ہیں جو ہو سو ہو تقدیر سمیت
لائے گا حشرِ دگر غُل ترے دیوانوں کا — حشر کو قبر سے اُٹھیں گے جو زنجیر سمیت
ٹپٹاتا ہوا آتا ہے کسے کر کے تو ذبح — آستیں خوں میں بھری ہے تری شمشیر سمیت
شبِ مہتاب میں افشاں کا تری عالم دیکھ — صدقے ہوتے ہیں ستارے فلکِ پیر سمیت
کھیل تقدیر سے جس وقت بگڑ جاتا ہے — حکما سارے دھرے رہتے ہیں[1] تدبیر سمیت
پیش بینوں کے جو زر ہاتھ کبھی آتا ہے — خانہ کرتے ہیں بنا قبر کی تعمیر سمیت
اس گنہ پر کیے مانی کے قلم اُس نے ہاتھ — اُس کی تصویر لکھی تھی مری تصویر سمیت
دل پہ گھونسا سا لگا جوں ہی کہا قاصد نے — نامہ پُرزے ہوا سرنامے کی تحریر سمیت
پیش جاتی ہی نہیں بات کسی کی اُس سے — خود لبِ ناطقہ یاں بند ہیں تقریر سمیت
بھاگے کس واسطے ابرو سے ترا خالِ جبیں — زاغ ڈرتا ہے جو دیکھے ہے کماں تیر سمیت
ہو نہ عاصی کا مددگار کہ آدم سا بشر — باغِ جنت سے نکالا گیا انجیر سمیت

مصحفی میرے صنادید کی مت پوچھ کہ وہ
طُمعۂ خاک ہوئے منصب و جاگیر سمیت

48

رکھے ہے حور ہی ایسی تو نے پری صورت — نہ پیاری پیاری لگے کیونکہ سانولی صورت
کرم کرے تو مصور جو کھینچ کر لاوے — میں چاہتا ہوں جسے، اُس نگار کی صورت
سب اُس کی وضع میں ہیں رنگ ڈھنگ بجلی کے — کم آئی دیکھنے میں ایسی اچپلی صورت

1۔ اصل: ہیں گے

یہ کب روا ہے میں محروم یک نظارہ رہوں اور اُٹھ کے صبح تری دیکھے آرسی صورت

نہیں اُترتی ہے چت سے جو خواب میں بھی کبھی
کُھبی ہے دل میں مرے کس کی مصحفی صورت

49

عشق کا آکر چڑھا مجھ کو جو بھوت ہو گئے تارِ گریباں کچے سُوت
عزلتی کا ہے وہی روزی رساں جو رِحم میں طفل کو دیتا ہے قُوت
وصف اُس کے کیا کہے یہ ناطقہ غیر از سبحان حیٍ لا یموت
چودھویں کا چاند آیا ابر میں منھ سے جس دم مَل لیا اس نے بھبھوت
طفل کیا ہو حقِ مادر سے ادا کرتی ہے کیا کیا وہ اس کا گُوہ مُوت
نرم خور ہے کیوں نہ وہ ریشم ہگے کرم پیلے کی غذا ہے برگِ توت
دلّی والوں کی عجائب رسم ہے ریش منڈواتے ہیں، رکھتے ہیں بروت
فضل سے اللہ کے سالم رہے حضرتِ یونس میانِ بطنِ حوت
کی قناعت جس نے آخر اُس کا جسم خشک ہو کر رہ گیا جوں عنکبوت

ایک کی باقی رہی ہرگز نہ نسل
مصحفی راون کے جو ستّر تھے پوت

ج

50

قافیہ خونِ جگر پر جو مرے تنگ ہے آج اشک جو چشم سے گرتا ہے سو بے رنگ ہے آج
رات میں بالشِ سر جس کو کیا تھا اپنا سینہ کوبی کے لیے ہاتھ میں وہ سنگ ہے آج
نہیں کٹتی ہے گلے کی جو مرے ایک بھی رگ دمِ شمشیر پہ قاتل کی مگر زنگ ہے آج

مقتلِ یار میں ٹک لے تو چلو، اے یارو! واں ہمیں سر سے گزر جانے کا آہنگ ہے آج
بے وفاؤں کی محبت کا بھروسا ہی نہیں جس سے کل یار تھے ہم، ہم سے اُسے ننگ ہے آج
لڑکھڑاتا ہوا آتا ہے وہ مستوں کی طرح اس کی رفتار کا دیکھو تو عجب ڈھنگ ہے آج
چشم کے سانچے سے ڈھالیں ہیں یہ ہر دم گولے تیر باراں سے جو اشکوں کو مرے جنگ ہے آج
گرچہ مانی نے بنائی ہیں شبیہیں لاکھوں دیکھ کر پر تری تصویر کو وہ دنگ ہے آج
مصحفی یاد میں کس فندقِ پا کی رویا
خوں میں ڈوبا ورقِ دانش و فرہنگ ہے آج

51

میں نے جد رخش سے رکھا شطرنج میرے اُس کے مساوی تھا شطرنج
شغل کچھ چاہیے امیروں کو اس میں ہو تختۂ نرد یا شطرنج
ہو نہ حلوائے چوبیں اس کا نام رکھے ہے ایسا ہی مزا شطرنج
برد کرلی تو جیت کون سی ہے اور جو قائم رکھا تو کیا شطرنج
نقش ہیں دل پہ میرے نقشِ علی کہ وہ کھیلیں تھے بے خطا شطرنج
چودھری جی بھی اس زمانے میں ق کچھ نہیں کھیلتے برا شطرنج
پر میاں مصحفی کی چال پہ بھی
جی سے ہوتا ہے خود فدا شطرنج

چ

52

لیے آدم نے اپنے بیٹے پانچ بھدی ہوتی ہے پولے پولے آنچ
قیدِ مذہب سے مجھ کو کیا مطلب میں نہیں جانتا ہوں تین اور پانچ

کس دہن نے یہ اُس کو تنگ کیا	طفلِ غنچہ کی جو نکل گئی کانچ
آدمی ہے وہی جو دنیا میں	جھوٹ کو جھوٹ جانے، سانچ کو سانچ
اُستخواں بندیِ تنِ مجنوں	اپنی نظروں میں ہے پتنگ کا ڈھانچ
رامِ مجنوں نہیں ہوئی لیلیٰ	مثلِ آہو برہ بھرے ہے کلانچ
گو پڑھیں تو نے سو کتاب تو کیا
مصحفی ایک خطِ جبیں کو تو بانچ

53

ویسے چمن ملا اسے حبِ وطن کے بیچ	قیدی قفس کا کس لیے جاوے چمن کے بیچ
بے رزق آفریدہ نہ دیکھا جہان میں	پتھر کے کیڑے کے بھی ہو پتا دہن کے بیچ
پاسِ ادب ہے اُس کو یہاں تک کہ داغ و شمع	دیتا نہیں ہے دود تری انجمن کے بیچ
کیا جانے اختراع میں صانع کی کیا رہا	باقی ہیں گردشیں ابھی چرخِ کہن کے بیچ
طالع میں نکلیں اپنے بھی صحرا نوردیاں	کھولی جو فالِ وصل کبھی نل دمن کے بیچ
شب آئے چشمِ شمع سے آنسو ڈھلک وونہی	پروانہ رہ گیا جو تڑپ کر لگن کے بیچ
انصاف پیشہ جتنے ہیں دنیا میں مصحفی
سمجھیں ہیں مغتنم تجھے اہلِ سخن کے بیچ

د

54

عدم میں تھا مری آنکھوں کو خواب سے پیوند	کھلی ہیں اب تو رکھیں ہیں کتاب سے پیوند
چمن کے بیچ جو گل مہندی یہ گلابی ہے	ہوئی تھی روزِ ازل کیا گلاب سے پیوند
رہے گا دل کو مرے بعدِ مرگ جوں سیماب	بہ زیرِ خاک بھی اک اضطراب سے پیوند

جدا جدا مرے یوں لختِ دل بھنے سرِ سیخ　نہ ہو کباب کو جیسے کباب سے پیوند
بصد تموجِ دریاے حسن رکھتی ہے　شکنجِ زلف تری موجِ آب سے پیوند
ہے ان دنوں میں بہت ست، پر یہ نالہ مرا　کبھی رکھے تھا یہ بالِ عقاب سے پیوند
میں فہمِ شاہدِ عصمت کا اُس کے بندہ ہوں　کیا ہے کس دلِ خانہ خراب سے پیوند
ہوں حسن دوست میں اتنا کہ مشتِ خاک مری　رکھے ہے نخلِ گلِ آفتاب سے پیوند
حریفِ دلقِ گدایاں بنا ہے یہ تنِ ریش　لگے ہیں جس میں فزوں تر حساب سے پیوند
ہوئی نہ دید سے اُس کی تسلیِ دلِ چاک　نہ ہوسکا یہ کتاں ماہتاب سے پیوند
نہ مفلسی کا ہو اہلِ فنا کو ہرگز غم[1]　رہے ہے دور لباسِ حباب سے پیوند
نہ چشمِ بند میں اُس ماہ رو کے ہیں سوراخ　یہ پُتلیوں نے کیا ہے نقاب سے پیوند
برنگِ شاخِ گلِ سرخ اس گلستاں میں　ہے میرے ہاتھ سے جامِ شراب سے پیوند
وہ کُہنہ دلقِ گدا پارہ پارہ دل ہے مرا　کیا ہے میں نے جسے اک عذاب سے پیوند
شمیم دوست ہے بھونرے کی طرح مردمِ چشم　کرے ہے اُڑ کے یہ پیدا شباب سے پیوند
میں کیا کہوں دمِ پامال رَخشِ کُشتہ ترا　ہوا ہے خاک کا کس کس عذاب سے پیوند
کلام میؔر کا ہو مصحفیؔ کہ مرزؔا کا
نہ پاسکے گا مرے انتخاب سے پیوند

55

میں کھولوں لب سے گر اپنے بہ شعر خوانی بند　زباں کو اپنی کرے دفعتاً فغانی بند
شبِ فراق دعا اک اثر نہیں کرتی　مگر کہ ہوگئے درہاے آسمانی بند
کسی کو قتل نئے طور سے کرے گا تو کیا　نیا رکھے ہے تری تیغ اصفہانی بند
رُلا رہا ہے صنم ہم کو اشکِ زنگاری　ہے چوڑیوں کا تری یہ جو آسمانی بند
اب تبے وہی، ویسی ہی گالیاں دینی　رکھے ہے کچھ بھی اب تیری بدزبانی بند

1۔ رنج: حاشیہ

لکھوں میں گریۂ خونیں کا خط میں کیا احوال نہ جب تلک کوئی ہاتھ آئے زرفشانی بند
لگا وہ سرمہ کہ بہزاد دل پہ کھائے سناں دکھا وہ آنکھ کہ ہو جائے چشمِ مانی بند
کرے جو بحر تماشا خرام کا تیرے تو موج ٹھٹکے وہیں، ہووے بہتا پانی بند
رہے نہ عقدۂ مشکل کوئی اگر شبِ وصل قبا کے کھول دے اپنی وہ یارِ جانی بند
الٰہی دیکھے نہ صیاد روزِ خوش گاہے قفس میں جیسے کیا میرا دانہ پانی بند
گر ایک آوے ہے تو ایک یاں سے جاوے ہے ہوئی نہیں کبھی راہِ جہانِ فانی بند
تو ہفت بند کو پڑھ محتشم کے عشرے میں نہ بہتر اس سے سمجھ بہر پیش خوانی بند
نگاہِ عجز نے شاید اثر کیا دمِ صبح جو ہو گیا ترا خنجر بصد روانی بند

تو آزما اُسے اے مصحفی بخصم قوی
جو یاد ہو کوئی کُشتی کا پہلوانی بند

ر

56

جوں ادھ جلی لکڑی کہ فروزاں ہو مکرر آتش میں دلِ سوختہ سوزاں ہو مکرر
ہم نے بھی سپر سینے کے داغوں کی بنا دی گو تیر فگن وہ صفِ مژگاں ہو مکرر
دو شب تو بھلا دل مرے مردے پہ جلاؤ تا روشنیِ گنجِ شہیداں ہو مکرر
اک قطرۂ اشک اپنا اگر جوش میں آوے عالم میں عیاں نوح کا طوفاں ہو مکرر
دیجے کبھی اپنے لبِ پاں خوردہ کو جنبش تا زندگیِ عاشقِ بے جاں ہو مکرر
زلفوں کے مصور نے غضب مجھ پہ یہ توڑا یا رب نہ کسی کی شبِ ہجراں ہو مکرر
پھر دستِ حنائی تو اُسے اپنے دکھا دے تا غرق بہ خوں پنجۂ مرجاں ہو مکرر
دشمن نے مجھے چشمِ غلط کار سے دیکھا جوں دیدۂ احول میں پریشاں ہو مکرر

اے مصحفی آخر تو ہے نواب کا ایماء
اس طرفہ زمیں میں تو غزل خواں ہو مکرر

57

پیاں اگر اک ٹوٹے تو پیاں ہو مکرر
تا اپنے کیے پر وہ پشیماں ہو مکرر

کب ایک سے ہووے گی نگہبانیِ جاناں
ڈیوڑھی پہ نہ تا صورتِ درباں ہو مکرر

یا رب مجھے پیری میں تو وہ دن نہ دکھانا
جو ظلم بر افتادنِ دنداں ہو مکرر

یہ سچ ہے کہ عشرت جو گئی پھر نہیں آتی
ہرگز گلِ افسردہ نہ خنداں ہو مکرر

قندِ لبِ معشوق کی تعریف یہی ہے
ہر چند کہ چسپاں ہو وہ خنداں ہو مکرر

کب شربتِ عناب لبِ یار کو پہنچا
گو شربتِ دردِ گلِ خنداں ہو مکرر

اے مرگ! خبر جلد لے آ کر یہ کہاں تک
آنکھوں میں مری عالمِ امکاں ہو مکرر

ہستی بہ سرِ پرتوِ نورِ ازلی ہے
فانوس مین جوں شمع فروزاں ہو مکرر

ہوں مصحفی کے ہم تو تب اسلام کے قائل
یہ کافرِ بے دیں جو مسلماں ہو مکرر

58

شبِ وصال گئی ہم سے منھ چھپا آخر
ہمارے سر پہ سحر لائی ہی بلا آخر

یہی سمجھ کے بھلا پاسِ دوستی کیجے
کبھی تو ہم بھی تمھارے تھے آشنا آخر

پڑھے تو جاؤ اسے تم، یہ خط ہے عاشق کا
نکل رہے گا کہیں اس کا مدعا آخر

لبوں پر اُس کے دھڑی جو جمی ہے مسّی کی
یقیں کہ خون ہی برسائے یہ گھٹا آخر

گماں میں اپنے وفادار جس کو میں سمجھا
ہزار حیف کہ نکلا وہ بے وفا آخر

کیا ہے بادِ خزاں نے گلوں کا ستیا ناس
نہ کام آئی ہواداریِ صبا آخر

قلم کا سینہ ہوا چاک، پھٹ گیا کاغذ
جگر تراش تھا عاشق کا ماجرا آخر

میں ناامید نہیں اُس کی مہربانی سے
اثر کرے گی کسی صبح تو دعا آخر

نہ کریو عمرِ دو روزہ پہ مصحفی تو غرور
کہ آدمی کو نہیں چھوڑتی قضا آخر

59

کچھ اس کے سِوا سوجھتی تدبیر نہیں اور
اُٹھ جاویں گے اس کوچے سے اک روز کہیں اور

خوباں کی محبت ہمیں کچھ راس نہ آئی
جوں جوں انھیں چاہا یہ ہوئے برسرِ کیں اور

کیا پوچھے ہے اے شوخ! تو دلدادہ ہے کس کا
تجھ سے بھی زیادہ ہے کوئی زہرہ جبیں اور

کھرّے[1] سے مرے دوست نہ گھبرائیں تو بہتر
یہ زمزمہ ہے بانفسِ باز پسیں اور

مشتاق ہوں سارا ترا چہرہ نہیں دیکھا
پردے کو ذرا کھینچ دے، اے پردہ نشیں! اور

یکّی پہ ترے لختِ جگر اپنا بٹھایا
زیبندہ نہ تھا اُس پہ، مری جان! نگیں اور

کوچے میں ترے گرچہ ہوئے کُشتوں کے پُشتے
اس پر بھی ابھی تشنۂ خوں ہے یہ زمیں اور

اُٹھ کر کے، مری جان! تو لگ جا نہ گلے سے
اس وقت تو مجلس میں تری کوئی نہیں اور

کیا جلد اجل نے ترے کوچے سے نکالا
دو چار دن اے کاش کہ رہتا میں وہیں اور

ہے یار کے آنے کی خبر سینے میں اپنے
نالے کا ابھی ضبط کر، اے جانِ حزیں! اور

ہے مصحفی اس کو میں جو رہنے کی مناہی
تو ڈھونڈ نکالیں گے مکاں کوئی ہمیں اور

ڑ

60

زور اگر ہے تو دلا! تو بُتِ پندار کو توڑ
بُت پرستی نہ کر، اس کفر کی زنّار کو توڑ

1۔ کھرا: دم گھٹنے کی آواز (پلیٹس)

کیا بُری خو ہے کہ صیاد جو کرتا ہے اسیر پھینک دیتا ہے پرِ مرغِ گرفتار کو توڑ
صبح ہوتے کہ دی چورے کو مل اے دل(؟) یار ہمسائے کی اک رات تو دیوار کو توڑ
بوسۂ گل بھی تو لینا ہے تجھے مرغِ اسیر تیلیوں میں تو قفس کی سرِ منقار کو توڑ
میں جو چاہا کہ گلے اس کو لگالوں شبِ وصل اس نے جھنجلا کے ووں ہی پھینک دیا ہار کو توڑ
ابھی اے جوشِ غمِ عشق نہیں صبر کا وقت اس کو آنے دے مرے گریے کے مت تار کو توڑ
توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کے تئیں فوجِ دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ
بوسۂ سیبِ ذقن دے اسے صدقے تیرے دل سے بیمار مرا، مت دلِ بیمار کو توڑ
سخت جانوں پہ لگا سخت تبر[1] کا ہے جو شوق سنگ و آہن پہ، مری جاں! تو نہ تلوار کو توڑ
خون بلبل کا کیا مفت چمن میں جا کر سخت نادم میں ہوا غنچۂ گلزار کو توڑ

مصحفی تجھ کو بد و نیک کا لازم ہے لحاظ
اک طرف گل کہ نہ اس باغ سے تو خار کو توڑ

ز

61

کیا غم ہے مری آہ کا پودا جو نہیں سبز نخلِ چمنِ عشق بھی ہوتا ہے کہیں سبز
پہنے ہے جو پوشاک تو، اے خانہ نشیں! سبز عکس اُس کے سے آتا ہے نظر چرخِ بریں سبز
جس شخص نے دیکھی ہیں مسیں بھیگتی اُس کی اُس کا سخن اک بات میں ہوتا ہے وہیں سبز
سم کھانے سے کمتر بھی نہیں مرگ کی ہیبت چہرہ نہ ہو ہر اک کا دمِ بازپسیں سبز
ملتا ہے محبت میں مگر خضر کا رتبہ پانو تلے عاشق کے جو ہوتی ہے زمیں سبز
یہ ضبط کیا دردِ محبت کو کہ میرا رخ زرد ہوا گا ہے تو پھر رنگِ جبیں سبز
تپلی بُتِ کافر کی نظر آئی کرنجی یا چشم کے خاتم میں رکھے اُس نے نگیں سبز

1۔ اصل: سخت بری

ہیرا بھی نظر آنے لگا مجھ کو زمرد　　جس وقت کہ ڈانک اس نے رکھا زیرِ نگیں سبز
کس عاشقِ مسموم کو قاتل نے کیا ذبح　　جو ہو گئے جوہر ترے، اے خنجرِ کیں! سبز
عاشق کو دمِ نزع جو تھی مرگ کی ہیبت　　گہہ چہرہ سپید اُس کا ہوا، گاہ جبیں سبز
ٹکڑے یہ زمرد کے مگر ٹانکے ہیں اس نے
کچھ کپڑے کے پُرشوخ کے محرم پہ نہیں سبز (؟)

ف

62

بعد مدت کے چلے ہیں پھر گلستاں کی طرف　　لے چلیں چاکِ گریباں نذرِ رضواں کی طرف
آفتابِ حشر نے کھائی ہیں از بس سیلیاں　　منہ نہیں کرتا کبھی میرے شبستاں کی طرف
جرم کرنے پر نہیں موقوف حبسِ دائمی　　اپنا پائے شوق خود جاتا ہے زنداں کی طرف
چشمِ لیلیٰ کی سی خو بو اُس میں کچھ دیکھی جو ہے　　التفاتِ عامری چشمِ غزالاں کی طرف
کیا ارادہ قتل کا میرے ہے جو دیکھے ہے شوخ　　تیغ کی جانب کبھی، گاہے نمک داں کی طرف
مجھ کو اور مجنوں کو آیا ذی سلم [1] اور نجد خوش　　شہر کی جانب گیا میں، وہ بیاباں کی طرف
عشق جب ظاہر ہوا فتنے کا باعث ہووے ہے　　جا نہیں سکتی ہے لیلیٰ اب دبستاں کی طرف
اُن کے شیون کا جو کرنا اس کو یاد آجائے ہے　　ہاتھ رکھ لیتا ہے وہ لے جاکے مژگاں کی طرف

63

کیا فائدہ جو زخموں کو اب رکھیے ٹانک ٹانک　　کھیرے کی طرح دل ہی ہوا جب کہ پھانک پھانک

1۔ اصل میں اس لفظ کے نیچے لکھا ہے: ''نام جگہ''۔

لیلیٰ جو مر گئی تو زنانِ قبیلہ نے ماتم تمام رات رکھا منہ کو ڈھانک ڈھانک
تجھ سا پری میاں تو نہ کوئی نظر پڑا یوں لاکھ خوبرو گئے غرفے سے جھانک جھانک
زخمی ہوا ہوں کس کے میں ناوک کے پانک کا جو دل پڑا پکارے ہے سینے میں پانک پانک
یاقوتِ لختِ دل کی نہ قیمت چکی دریغ حیراں رہے مقیم بہت اس کو آنک آنک
پہنچا دیا بہ منزلِ مقصود مصحفی
چوبِ قلم سے میں خرِ مُفتی کو ہانک ہانک

64

اپنے پاتا نہیں آتش کدۂ داغ میں آگ کہ لگادوں میں کسی باغ میں یا راغ میں آگ
لال گولوں سے ہے جیسی کہ لگی باغ میں آگ لگیوا ے لالہ اسی رنگ مرے داغ میں آگ
عشق سادہ کو جلاتا ہے ولیکن بدرنگ جس طرح دیر لگے ہیزمِ بے داغ میں آگ
گر منگاؤں اُسے میں سوختہ جاں وقتِ طعام شیر میں اُٹھے دھواں اور لگے قیماغ میں آگ
چاہیے نالۂ بلبل کی نہ تقلید کرے لگ اُٹھے گی نہیں اک دن دہنِ زاغ میں آگ
جوں ہرے پیڑ سے صانع نے لگائی آتش دھانی جوڑے نے لگادی دلِ صباغ میں آگ
میں وہ وحشی ہوں کہ بے خوف اُدھر جاتا ہوں بھتنے راتوں کو اچھالیں ہیں جہاں راغ میں آگ
بانسیوں میں نہیں جگنو یہ چمکتے شبِ تار کھنڈ رہی ہے یہ کسی دل کے مگر راغ میں آگ
خانہ سوزی کا مری پوچھو نہ باعث کوئی ہے یہ مشہور کہ لگ اُٹھے ہے خود راغ میں آگ
مصحفی خاک میں کھاؤں کہ ہے مجھ سے تو میاں
تافتاں تافتہ رو گھیے سو فتور داغ میں آگ

ل

65

چاکِ گل جب گئے میرے جگرِ چاک میں مل — ستم اس رشک سے فی الفور گئے خاک میں مل

تند و پُرزور ہے ہر چند شرابِ انگور — اور بھی تیز ہوئی نشۂ تریاک میں مل

اینٹھتا ہے تو جو مستوں سے، گئے ہیں شاید — پیچ و خم زلف کے تیری شجرِ تاک میں مل

شاہدِ گل کو رکھے مرغِ چمن کیوں نہ عزیز — اُس کی پوشاک گئی ہے تری پوشاک میں مل

آج گل رنگ جو گرتے ہیں مرے اشکِ سپید — خوں گیا اور مگر دیدۂ غم ناک میں مل

دورِ خط میں وہ ترے حسن کا عالم نہ رہا — یہ گلِ تازہ گیا کیا خس و خاشاک میں مل

یادِ کشمیر میں کل مصحفی اتنا رویا
کہ سرشک اس کے گئے چشمۂ ورناک میں مل

66

آیا جو رات گھر سے وہ جانِ جہاں نکل — یکبار میرے منھ سے گیا ''الاماں'' نکل

پیچھا کسی طرح یہ مرا چھوڑتا نہیں — ہاتھوں سے عشق کے کوئی جاوے کہاں نکل

پائے ثباتِ عشق میں قائم نہ ہوسکا — اس معرکے میں بھی گئے کیا کیا جواں نکل

جاسوس لگ رہے ہیں صنم تیری گھات میں — برقعے میں منھ چھپا کے نہ شب کو نہاں نکل

کنجِ قفس میں دیر رہا اس قدر کہ ہائے — دل سے گئی مرے ہوسِ گلستاں نکل

ہم بار کرتے رہ گئے رختِ سفر دریغ — اتنے میں ہمرہوں کا گیا کارواں نکل

در سے لگا کھڑا ہوں ترے انتظار میں — پردے سے باہر آ کسی صورت، میاں! نکل

اب مل چلو وگرنہ یہ پوچھے گا پھر کوئی — عارض پہ جب تمھارے خط آیا بُتاں نکل

گر دست بردِ غیر سے عاجز نہ تم ہوئے — کہنی سے آستیں گئی پھر یہ کہاں نکل

جب بندوبستِ موسمِ گل ہر طرف ہوا آئی بہار کہتی ہوئی ''باغباں! نکل''
اتنا لحاظ کر کہ ترے وقتِ غیظ و خشم کتے کی طرح منھ سے نہ آوے زباں نکل
روتا ہوں میں کہ قافلے کے پیچھے چھوڑ کر مجھ سے گئے ہیں دور، مرے ہمرہاں نکل
پہنچا ہے وقت بر سرِ خصمی ہے آسماں اب منھ سے میرے نالۂ آتش فشاں نکل
مجھ کو یقیں ہے شانِ تغافل سے یار کی عاشق کی آرزو ہی میں جاوے گی جاں نکل
رستم کو تب یقین ہوا ہاں خدا بھی ہے پہلو سے اس کے جب گئے تیر و سناں نکل
حسن اس کو یوں کہے ہے کہ تارے ہیں بدنظر آنگن میں رات کو نہ تہِ آسماں نکل
بازو کا تیرے مردمِ آبی میں ذکر تھا دریا کو چھوڑ کر کے گئیں مچھلیاں نکل
آخر گدازِ عشق سے تن پوست رہ گیا گھل کر مرے بدن سے گئے استخواں نکل
ناقے نے دشتِ نجد میں کیں بسکہ شوخیاں آخر گئی مہارِ کفِ سارباں نکل

تو اب تو چھوڑ گوشۂ عزلت کو مصحفی
آئی بہار اور گئی فصلِ خزاں نکل

67

کچھ میں نہیں اک راحت و آرام سے معزول پیری نے کیا ہے مجھے سو کام سے معزول
پر بستہ کبوتر کی طرح رکھے ہے صیاد ہم کیونکہ نہ ہوں سیرِ در و بام سے معزول
مفلس کے دیے کی سی طرح داغِ دل اپنا اک شب نہ جلا بسکہ ہوا شام سے معزول
گر ہے دلِ قاصد کی یہی لاگ تو اک دن ہو جائے گا یہ نامہ و پیغام سے معزول
ہے عشق کی مستی مجھے بس ہاتھ کو میرے گو رعشۂ پیری نے کیا جام سے معزول
صیاد کی مرضی ہے کہ ہر مرغِ گرفتار محبوسِ قفس ہووے جو ہو دام سے معزول
گرداوریِ عاملِ خط دیکھ کے اُس کی زلفیں ہوئیں رخسارۂ گلفام سے معزول
تنگی یہ دہن کی ہے تو اک روز کرے گی ہونٹوں کو ترے خدمتِ دشنام سے معزول

دیکھ اس بُتِ کافر کے رخِ سادہ کا عالم
سو ہم سے ہوئے مصحفی اسلام سے معزول

68

ناگفتنی ہے قصۂ دور و درازِ دل
یاں کون ہے میں جس سے کہوں اپنا رازِ دل

دیکھا تو آج اس میں بھی مطلق صدا نہیں
تھا ناقۂ ضعیف جو شب چارہ سازِ دل

شیشے پہ شیشے ٹوٹتے جاتے ہیں یاں ہزار
مجلس میں اُس کی کون کرے امتیازِ دل

اے وائے وہ بھی اُس نے منڈایا ہے گھونٹ گھونٹ
سبزہ جو خط کا تھا سببِ اہتزازِ دل

کیونکر رکھوں نہ عشق کی آتش کو میں عزیز
اک داغِ تازہ روز کرے ہے نیازِ دل

دولت یہی، متاع یہی، مال ہے یہی
اپنا تو بے کسی پہ ہے اپنی نیاز دل

پانو پہ سر رکھوں گا تو مجھ سے منے گا یار
محراب میں قبول نہ ہوگی نمازِ دل

صنعت سے شیشے اشک کے مژگاں پہ کر رواں
بے چین کر گیا مجھے شب شیشہ بازِ دل

واقسمتا! کہ مجھ سے ہے محبوب کو مرے
ویسی ہی نفرت اور وہی احترازِ دل

عاشق نہ ہو کسی کی کہیں یہ بھی مصحفی
آتی ہے مجھ کو شمع سے بوے گدازِ دل

69

ہے سبک جیسے تفنگِ کفِ معشوق کا نال
چاہیے ہووے اس انداز پہ بندوق کا نال

شوق ہے گولے لگانے کا ہمیں بجوا دیں
ہاتھ آوے کسی عمدہ کے جو صندوق کا نال

بھر کے چھرّے جو وہ گل چھوڑے ہے داغستانی
افعیِ دشمنِ جاں ہووے ہے صد جوق[1] کا نال

پیچ داری میں سمجھتے ہیں اُسے سب بہتر
گز کا محتاج نہیں آہنِ فغروق کا نال

آتش افروزوں کو ہے اپنے بھی تن کا خطرہ
نہیں پھٹتا ہے ہوادار ہی بندوق کا نال

جاں بری کیونکہ ہو، اے طفلِ فرنگی! تجھ سے
کم طمنچے سے نہیں ہے یہ تری بوق کا نال

قطع رزق اُس کا تو کرتا نہیں رازق ہرگز
غم نہیں ہے جو کٹا کودکِ مرزوق کا نال

میرے نالے کی قرابین میں ہے توڑ بڑا
نقش والوں کا مٹا صورتِ عیوق کا نال

1۔ اصل: جوف

کوٹھی والی کے سدا مصحفی ہم گاہک ہیں
مفت لیں اس کو نہ ستا بکے گر سوق کا نال

70

مسلخ عشق میں کھنچتی ہے خوش اقبال کی کھال
بھیڑ بکری سے ہے کم قدر بد اعمال کی کھال

جس کی بوسے کے تصور سے چھلے گال کی کھال
تاب کیا لاوے عرق پونچھتے رومال کی، کھال

نقش اس کا بھی کیا دورِ فلک نے باطل
تھی جو کاوے کے علم سے بندھی اقبال کی کھال

نہیں قصابِ اجل سے کوئی بے غم ہرگز
پوستیں چھینے یہ منعم کی تو کنگال کی کھال

تن دہی جب نہ کریں کام میں استاد کے یہ
قمچیوں سے نہ اُدھیڑے وہ پھر اطفال کی کھال

بند رومی ہے سمور اُس کے پہ کام آں روزوں
دیکھنے میں کبھی آئی نہ تھی اس جال کی کھال

بدگمانی نہ ہو کیوں تب کے گئے پر افزوں
دیکھ اُکھڑے لبِ معشوق کے تبخال کی کھال

مالک الملک نصاریٰ ہوئے کلکتے کے
یہ تو نکلی عجب اک وضع کی جنجال کی کھال

جھریاں کیوں نہ پڑیں عمر فزوں میں منھ پر
تن پہ جب لائے شکن پیر کہن سال کی کھال

شمس تبریز نے مُردے کو کیا تھا زندہ
شرع نے کھینچی عبث ایسے خوش اعمال کی کھال

کام از بس کہ زمانے کا ہوا ہے برعکس
چور کھنچوائے ہے اس عہد میں کتوال کی کھال

نفسِ گرم سے لیتا ہے وہ اکسیر بنا
دھونکنی دم کی ہے شاعر کے زرومال کی کھال

اتنے بے کار نہیں جانورِ آبی بھی
داستانوں کے تو کام آتی ہے گھڑیال کی کھال

فکر میں موے کمر کی ترے حیران رہے
وہی دقاق جو کھینچے ہے سدا بال کی کھال

اتنا مقدور مجھے دیجو تو، اے مہدیِ دیں
مارے کوڑوں کے اُڑا دوں خرِ دجّال کی کھال

داغِ دل چھن گیا یوں سوزنِ مژگاں سے تری
جس طرح ہووے مشبک کسی غربال کی کھال

نہیں بے وجہ گرفتاریِ درویش اس میں
آہو و شیر کی ہوتی ہے عجب حال کی کھال

جس کے ہر دانے سے ایک قطرۂ خوں ٹپکے ہے
ہے منڈھی میان پہ قاتل کے عجب حال کی کھال

تن کو پیری میں ریاضت سے دباغی کر دوں
مصحفی چمڑے کا چرسا ہے یہ اور کھال کی کھال

م

71

ایسے ڈرے ہیں کس کی نگاہِ غضب سے ہم
بدخواب ہو گئے ہیں جو دو چار شب سے ہم

کب کامیابِ بوسہ ہوئے اس کے لب سے ہم
شرمندہ ہی رہے دلِ مطلب طلب سے ہم

بوسہ نہ لے سکے کفِ پا کا ادب سے ہم
کاٹیں ہیں اس لیے کفِ افسوس شب سے ہم

سوداگرِ صفائے دلِ بے غبار ہیں
اجناسِ شیشہ لائے ہیں شہرِ حلب سے ہم

یہ روز ڈھونڈھ لائے ہے اک خوبرو نیا
شاکی ہیں اپنے ہی دلِ آفت طلب سے ہم

کشتی ہماری بحر کی ہے مانجدھار میں
نکلے ہیں کب کشاکشِ لطف و غضب سے ہم

طرزِ خرامِ ناز کی بے اعتدالیاں
دیکھیں ہیں، اور کچھ نہیں کہتے ادب سے ہم

برقعے میں ہو کہ پردۂ چادر میں خوبرو
پہچانتے ہیں وضع سے، شوخی سے، چھب سے ہم

شغلِ شراب و شیشہ و ساقیِ نغمہ سنج
تائب ہوئے ہیں عالمِ پیری میں سب سے ہم

بے لطف زندگی کے ہیں دن، آ بھی اے اجل!
تیرے ہی انتظار میں بیٹھے ہیں کب سے ہم

فن اتنا کم کیا ہے کہ ان روزوں مصحفی
دل میں اک انس رکھتے ہیں شعرِ عرب سے ہم

ن

72

شوق سے کیوں جانہ بیٹھے قتل کے میدان میں
سیار سینگے چیر کر رکھے ہیں جس نے ران میں (؟)

اُس سے خس بہتر جو شامے کو کرے ہے خوش دماغ
کچھ بھی بوے آدمیت ہو نہ جس انسان میں

مجھ پہ گل چینی کی تہمت باغباں کرتا ہے کیوں
دیکھ لے گلہاے حرماں ہیں مرے دامان میں

چاہتا ہوں اُس کو میں، وہ چاہتا مجھ کو نہیں
جان اپنی کیونکہ میں ڈالوں کسی کی جان میں

اہلِ نعمت سے نہ پاوے رزق اپنا بے نصیب
ریزہ چینی کب کرے طائر ہوا گو خوان میں

انقلابِ دہر سے غافل نہ رہ، اے بے خبر
کچھ سے کچھ ہو جائے ہے حالِ بشر اک آن میں

قافلہ یاروں کا کچھ آگے گیا شاید نکل
اب نہیں آتی ہے آوازِ جرس جو کان میں

آدمی کو غفلتِ دنیا نہیں دیتی نجات
صبح جو چونکا، ہوا مصروف اُسی سامان میں

الفتِ چسپاں پر اس کی رشک آتا ہے مجھے
رہ گیا ہے خوں لگا کس کا ترے پیکان میں

گر مزہ چاہو تو کُترو دل سروتے سے مرا
تم سپاری کی ڈلی رکھتے ہو ناحق پان میں

یوں دلِ سی پارہ میں ہیں داغِ عشقِ گل رخاں
جوں پرِ طاؤس رکھ دیوے کوئی قرآن میں

ناف کے گرداب میں ڈوبی ہے کشتی عقل کی
پارہ پارہ یہ نہیں ہرگز ہوئی طوفان میں

جو نہیں آئینہ ساں مژگاں جو جھپکیں مصحفی
عکس ہے صورت کا کس کی دیدۂ حیران میں

73

ہو گیا مائل بہ سرخی اس کا چہرہ دھوپ میں
ہم نے گورے حسن کا دیکھا تماشا دھوپ میں

خارداروں کا نہیں کرتا فلک نقصاں کبھی
دیکھ لو سرسبز رہتا ہے جوانسا دھوپ میں

تابِ حسنِ گرم لا سکتے نہیں نازک مزاج
دیر رہنے سے تڑق جاتا ہے شیشا دھوپ میں

کس پری کا ناز پروردِ نگاہِ لطف تھا
پانو جو سائے سے میں اصلا نہ رکھا دھوپ میں

سایۂ دیوار جو روزِ قیامت میں نہ تھا
مرگ چھالا اپنا واں ہم نے بچھایا دھوپ میں

تربیت کا باغِ عالم کی ہے مالک آفتاب
ہر شجر کا اُس سے ہی پکتا ہے میوا دھوپ میں

بیمِ جاں سے اس کو جو کوئی اُٹھاتا ہی نہیں
تیرے کُشتے کا پڑا جلتا ہے لاشا دھوپ میں

وصلِ دیدہ کو بلا ہے ایک غیبت کا فراق
ماہیِ ساحل نہ جاوے کیونکہ گھبرا دھوپ میں

شاہ سرمد کی طرح ہوں میں بھی سر سبز ازل　　نت ہرا، رہتا ہے یاں تربت کا سبزا دھوپ میں
معجزہ یہ باقی باللہ کا ہے اب تک دیکھ لو　　سنگِ تربت ان کا جو پاتے ہیں ٹھنڈا دھوپ میں

مصحفی تب ابرِ رحمت کو مری پہنچی خبر
ہو گیا جب خشک سب نخلِ تمنّا دھوپ میں

74

کل جو آیا رکھے وہ چہرے پہ پنکھا دھوپ میں　　اُس کی پیشانی سے ٹپکے تھا پسینا دھوپ میں
اس کے عارض سے ٹپکتا تھا پسینا دھوپ میں　　ہے تعجب کی جگہ مینہ کا برسنا دھوپ میں
کس کا قاصد ہے، دیا ہے کس نے خط اس کے تئیں　　سر کے بل خورشید جو جاتا ہے دوڑا دھوپ میں
ہو گی محبوبوں کے حق میں آفت اتنی بھی درنگ　　گر مغیلاں کے تلے ٹک ناقہ ٹھہرا دھوپ میں
دل کی جو سردی ہے وہ تو مندفع ہوتی نہیں　　صاحبِ تپ لرزہ گو اک لحظہ بیٹھا دھوپ میں
جو تپِ محرق میں جانے کے ہمیں اک لطف تھا　　وہ مزہ خورشیدِ محشر کی نہ پایا دھوپ میں
رخ سے لہرا کر زنخداں کے ہیں مائل موئے زلف　　دوڑتا ہے چاہ کی جانب ہی پیاسا دھوپ میں
داغِ دل کرتا ہے جب گرمی تو گر پڑتے ہیں اشک　　تابشِ خورشید سے ٹپکے ہے مہوا دھوپ میں
گریہ کم کرتا ہے عاشق کا فروغِ حسنِ شوخ　　خشک ہو جاتا ہے اکثر آبِ دریا دھوپ میں
نخلِ خرما ہی کوئی اُس پر لگا، اے باغباں!　　تربتِ مجنوں پہ ہووے کچھ تو سایا دھوپ میں

بس کہ تھا اللہ کو پاسِ رسول اے مصحفی
سر پہ اُس کے ابر کا رہتا تھا ٹکڑا دھوپ میں

75

کیا شادیوں میں پھرتے مدام ان کے ڈولے ہیں　　گاتیں جنھوں کی صاف ہیں، منہ بھولے ہیں
جی جل گیا ہے میرا ہجوم اس کا دیکھ کر　　چیچک کے داغوں سے مرے دل میں پھپھولے ہیں
بامِ فلک پہ گر وہ اُڑاتا نہیں پتنگ　　خورشید و ماہ ڈور کے پھر کس کی گولے ہیں

چشمِ پُر آب میں مری آتے ہی کُھل گئے　شاید کہ ساخت میں مرے آنسو یہ اولے ہیں
نر مادہ موتی کس کے میں رویا ہوں کر کے یاد　کچھ ہیں بڑے تو کچھ مرے آنسو مجھولے ہیں
دو چار چرخ قطب کی چھڑیوں میں کھا، دلا!　میواتیوں کے جھنڈ ہیں، ہر سو ہنڈولے ہیں
ہمرہ صبا کے آتے ہیں ٹکے شمیم کے　گلشن میں کس نے بندِ قبا اپنے کھولے ہیں
دکھلاؤں کیا میں اشکوں کی اُس کو تصاوری[1]　صفدر نہ لے سکے گا انھیں مہنگ مولے ہیں
کس طرح چگ نہ جاویں مرے دانہ ہائے اشک　آنکھیں پھڑک میں شوخ کی جیسے مولے ہیں
منھ جھلسے ہو گئے ہیں مری دودِ آہ سے　تارے نہ آسماں پہ سمجھ تو، یہ ہولے ہیں
خوباں کریں گے وصل کا وعدہ وفا، چہ خوش　کھاتے ہیں جھوٹی قسمیں، یہ ان کے بتولے ہیں
شیریں و تلخِ دہر سے اندھوں کو کیا خبر　وہ ہی کڑا کے اور وہی افیوں کے گھولے ہیں
قیمت نہ پاویں کیونکہ مرے قطرہ ہائے اشک　باریک جیسے شاہ جہاں پور کے جھولے ہیں
مرنے کا غم نہیں ہے کچھ اتنا تو، عمر کے　دن کیا گزر گئے، مجھے اس کے ملولے ہیں

جو جو عمل کیے تھے میں ہستی میں مصحفی
محشر میں عضو عضو مرے صاف بولے ہیں

76

کہیں کیا کس مصیبت سے فغاں بنیاد کرتے ہیں　کلیجا منھ کو آتا ہے جو ہم فریاد کرتے ہیں
بوقتِ ذبح سرخی خوں کی لیتے ہیں چرا ہم تو　دمِ آخر بھی پاسِ خاطرِ صیاد کرتے ہیں
ہمیں کرنی پڑے ہے اور اُلٹی التجا ان کی　غضب یہ ہے کہ ہم دلجوئیِ صیاد کرتے ہیں
نہیں ملتی رہائی ہم کو دستِ خوب رویاں سے　یہ ظالم جوں گلِ بازی ہمیں برباد کرتے ہیں
کیا تھا وعدہ "چھوڑیں گے تجھے فصلِ بہاراں میں"　سو یہ صیاد جھوٹے آج تک آزاد کرتے ہیں
بہانے سے تبسم آشنائے لب ہیں ہر ساعت (؟)　دیا ہے کچھ تو جو طفلی میں ہم کو شاد کرتے ہیں
عدم والوں کی صحبت سے بھی نفرت ہو گئی اب تو　کوئی ویرانہ اب سوے عدم آباد کرتے ہیں

1۔ تصاوری : یہ لفظ لغت میں نہیں ملا۔ ممکن ہے "نساوری" (نمکینی) یا "دساوری" ہو۔

تری تصویرِ خال و خط جو اُن سے کھنچ نہیں سکتی
سیہ بختی کا شکوہ مانی و بہزاد کرتے ہیں
سُمِ اسپِ بُتاں کی ٹھوکریں کھاتی تھی خاک اپنی
صبا سے اُڑ نہیں سکتی تو یہ برباد کرتے ہیں
ترے خالِ زنخداں کا تصور ساتھ ہے دل کے
یہی اک حبِ افیوں اپنی ہم معتاد کرتے ہیں
کہاں اے مصحفی پھرتا ہے تو وحشی سا، دیوانے
عدم والے تجھے، اے بے مروت! یاد کرتے ہیں

77

یار جب پُھسلا کے لائے یاں بیاباں سے ہمیں
اور بھی وحشت ہوئی افزوں گلستاں سے ہمیں
ایک ساعت اُس سے کر سکتے نہیں آنکھیں جدا
ہوگئی ہے اُنس سی تصویرِ جاناں سے ہمیں
آنکھ سے چھپتے ہی اس کے ناتوانی آگئی
قوتِ دل تھی ترے سیبِ زنخداں سے ہمیں
غفلتِ دنیا دکھاتی ہے سدا شکلیں مہیب
جاگنا اچھا ہوا خوابِ پریشاں سے ہمیں
چاہتے ہیں وحشتِ طبعِ جنوں دیوے بتا
جھونپڑا اک دور مجنوں کے بیاباں سے ہمیں
دشمنی کے روز تا شب گور ہے درپے رقیب
منع کر سکتا ہے کوئی ربطِ پنہاں سے ہمیں
ہم بہت چُوکے فریبِ عشوۂ لیلیٰ پہ ہائے
ساتھ مجنوں ہی کے اُٹھنا تھا دبستاں سے ہمیں
جا پڑے ہے اس کے اوپر جب نہ تب دستِ جنوں
پڑ گئی ہے لاگ سی اپنے گریباں سے ہمیں
ساون اور بھادوں کی بارش کا کچھ اندیشہ نہیں
ڈر جو لگتا ہے تو اپنی چشمِ گریاں سے ہمیں
عشقِ مژگاں نے ترے پھر ہم کو صحرائی کیا
تلوے چھدوانے پڑے خارِ مغیلاں سے ہمیں
جب تلک ہووے نہ طالع آفتابِ روئے یار
ہو رہائی کس طرح شب ہائے ہجراں سے ہمیں
ہم نہ جانبازی سے چُوکے گرچہ اپنے دوستدار
لے گئے زخمی اُٹھا سو بار میداں سے ہمیں
الجھے بالوں کی ترے نکلے ہے جو اس میں شبیہ
عشق سا اک ہوگیا ہے عشقِ پیچاں سے ہمیں
وحشتِ طبعِ جنوں پھر ہوش میں لائی مزاج
دوستی کرنی پڑی گبر و مسلماں سے ہمیں
اس لبِ پاں خوردہ کے اغیار نے بوسے لیے
کاٹنا آخر پڑا ہاتھ اپنا دنداں سے ہمیں

مصحفی اس بے قراری کا بُرا ہو، کیا کہیں
درد سے تسکین ہوتی ہے نہ درماں سے ہمیں

78

تم چاہو یا نہ چاہو، ہم تم کو چاہتے ہیں
اپنی طرف سے پیارے جب تک نباہتے ہیں

مر جائیں تو یہ چھوٹیں، بیمارِ چشم تیرے
کیا کیا بری طرح سے شب کو کراہتے ہیں

ابرو کا اُس کی مجھ کو خم کیوں نہ پھر خوش آوے
تیغ ولایتی کو سب ہی سراہتے ہیں

جس طرح جنسِ شادی لیتے ہیں اہلِ دنیا
بازارِ دوستی سے ہم غم بساہتے[1] ہیں

پامال مصحفی میں گاوانِ چرخ کا ہوں
یہ میرا خرمنِ عمر دن رات گاہتے ہیں

79

چرخِ اطلس نے ستاروں کی جو پائیں آنکھیں
روزنوں سے تری جالی کے لڑائیں آنکھیں

کشتِ نرگس نے تری رہ میں بچھائیں آنکھیں
آہ اتنی بھی مرے کام نہ آئیں آنکھیں

چمنِ دہر میں وہ گل ہی مرا ہے محبوب
گلِ نرگس نے جسے دیکھ جھکائیں آنکھیں

یاد کر رنگِ حنا کو میں ترے ہجر کی شب
اتنا رویا کہ مری خوں میں نہائیں آنکھیں

مجھ سا دیوانہ جو صحرائے جنوں سے گزرا
آبلوں نے مرے تلووں سے لگائیں آنکھیں

اب پلک سے جو پلک اُٹھتی نہیں اک ساعت
یہ مری کس کے تصور نے سلائیں آنکھیں

مصحفی دل میں مرے پھونکی جو غم نے آتش
مارے گرمی کے مری جوش کر آئیں آنکھیں

80

اپنی، قابل جو ترے رخ کے، نہ پائیں آنکھیں
حوریوں نے ترے تلووں سے لگائیں آنکھیں

نرگسی چشم ہزاروں ہیں پہ تیری، اے گل!
قلمِ صانعِ قدرت نے بنائیں آنکھیں

1۔ بساہنا: (ہ) فراہم کرنا

تُو تو واں آئینے میں سیر کرے ہے، بے درد! تجھ کو کیا غم کسی عاشق کی گر آئیں آنکھیں
مجھ کو کرتے تو کیا قتل و۔لے ہو نادم دیکھ کر لاشہ مرا اس نے جھکائیں آنکھیں
قابلِ دید نہیں ہے یہ جہانِ گزراں باز نے اتنی ہی خاطر تو سلائیں آنکھیں
جب ملی بینشِ تصویر کشی مانی کو
رخ بنانے سے تری پہلے بنائیں آنکھیں

81

بعدِ مُردن کی بھی تدبیر کیے جاتا ہوں اپنی قبر آپ ہی تعمیر کیے جاتا ہوں
چین مطلق نہیں پڑتا شبِ ہجراں میں مجھے صبح تک نالۂ شب گیر کیے جاتا ہوں
عفو پر عفو کی ریزش ہے اُدھر سے ہر دم اور میں تقصیر پہ تقصیر کیے جاتا ہوں
اُس کے کوچے میں جو دیکھے گا کرے گا مجھے یاد اپنی صورت کی میں تصویر کیے جاتا ہوں
اُٹھ کے تا کوچۂ لیلیٰ سے نہ جاوے یہ کہیں پانو میں قیس کے زنجیر کیے جاتا ہوں
اس کو دیتی ہی نہیں فائدہ کوئی دارو گو علاجِ دلِ دل گیر کیے جاتا ہوں
کوئی لے جائے اُسے یا کہ نہ لے جائے، یہ میں نامۂ شوق کی تحریر کیے جاتا ہوں
اُس کا کیا جرم مرے ہوش گئے ہیں کیسے جو علم غیر پہ شمشیر کیے جاتا ہوں
پیش جاتی نہیں یوں بھی مری اُس سے ہر چند شر و مکر و فن و تزویر کیے جاتا ہوں
نقشِ حُب چال سے نکلے ہے مری اس خاطر میں پری زادوں کی تسخیر کیے جاتا ہوں
مصحفی یار تو سنتا نہیں اور وحشی سا
حال کی اپنے میں تقریر کیے جاتا ہوں

82

ہر طرف سے جھوم جھوم آئیں گھٹائیں بدلیاں باغ میں وہ گُل نہ آیا، گو ہوائیں بدلیاں
فوجِ غم کو تھا جو عزمِ قتلِ نادر شاہِ دل رات بھر سینے میں اس نے کتنی جائیں بدلیاں
خوں کا آنا کم ہوا کب دیدۂ خونبار سے صبح تک میں اپنے بستر کی ردائیں بدلیاں
روے صحت دیکھنے پایا نہ بیمارِ فراق عیسیٰ مریم نے بھی کتنی دوائیں بدلیاں

شغلِ خوں ریزی رہا دن بھر جو قاتل کو مرے　　شام تک اُس نے قباؤں پر قبائیں بدلیاں

مردم آزاری پہ باندھی جس جفا جو نے کمر　　اپنے حق میں سب غریبوں کی دعائیں بدلیاں

حسن کی خاطر رہا ہم کو وطن ہی میں سفر　　لکھنؤ میں سال بھر ہم نے سرائیں بدلیاں

مصحفی بھادوں کی راتوں میں نہ نیند آئی مجھے
ہوگئیں حق میں مرے کالی بلائیں بدلیاں

83

شروعِ سال سے پھر ولولے ہوئے دل میں　　ہزار طرح کے پیدا گلے ہوئے دل میں

پھر آئی زلفِ مسلسل کی لہر پیشِ نظر　　پھر اک جنوں کے نئے سلسلے ہوئے دل میں

بہ شکلِ خوشۂ انگور کیوں نہ وہ بن جائے　　تپِ فراق سے پھر آبلے ہوئے دل میں

بعالمِ دو دلی ہم نے وہ نہیں دیکھے　　مزے اُٹھائے ہیں جو جو ملے ہوئے دل میں

کوئی بھی سوختہ گھر میں مقام کرتے ہیں　　خیال اُس کا رہے کیا جلے ہوئے دل میں

کیا جو ضبط نے برعکس کام گریے کا　　تو آنسوؤں کے رواں قافلے ہوئے دل میں

تصوراتِ حسیناں سے مصحفی شبِ دوش
وہ دل ہی جانے ہے جو مشغلے ہوئے دل میں

84

آتا نہیں وہ غیرتِ عیسیٰ نظر کہیں　　میں دردِ دل کہوں جو ملے چارہ گر کہیں

چاروں طرف زمانے میں کی سیر، پر کہیں　　اس کا سا حسنِ بشرہ نہ آیا نظر کہیں

اے نالہ! آگے عرشِ معلیٰ کا ہے مقام　　رکھیو نہ بے ادب تو قلم پیشتر کہیں

رکھا ہے ٹھور مجھ کو کہروے کے ناچ نے　　کولھا کہیں کو جاوے ہے اس کا، کمر کہیں

دامن میں بھر کے سیرِ چمن کو چلا ہوں میں　　لالے کو داغ دیں نہ یہ لختِ جگر کہیں

خطرہ رہے ہے بس یہی پیری کی صبح سے　　دل بجھ نہ جائے مثلِ چراغِ سحر کہیں

پھڑکے ہے کیا قفس میں تو بلبل بہ شوقِ گل　　قصہ تمام کر بھی پھڑک، اے مشت پر کہیں

سیبِ ذقن کی اُس کے لطافت میں کیا کہوں باغِ بہشت میں بھی نہیں یہ ثمر کہیں
کنجشکِ دل ضعیف نہایت ہے، ہے یہ ڈر لڑکوں کے ہاتھوں میں تو نہ جاوے یہ مر کہیں
ہر دم یہ بھر بھر آتی ہیں، ڈرتا ہے جی مرا رسوا کریں نہ مجھ کو مری چشمِ تر کہیں
نیرنگِ آسماں سے سدا میں نے مصحفی
دیکھا کہیں جو نفع تو پایا ضرر کہیں

85

رات آرسی پہ اُس کی پڑی تھی نظر کہیں تھا وقتِ صبح، تکیہ کہیں اور سر کہیں
صندل جبیں کوئی نظر آیا اگر کہیں خطرہ رہا یہ دے نہ مجھے دردِ سر کہیں
پاتا ہوں بے حواس تجھے ان دنوں، دو چار تجھ سے ہی تیری آنکھ ہوئی ہے مگر کہیں
چلّا نہ اتنا وصل کی شب، اے خروسِ صبح ظالم یہ کون وقت ہے نالوں کا، مر کہیں
زندانیانِ باغ سے بس اس کو کام ہے اب میں کہیں ہوں اور نسیمِ سحر کہیں
کس عضو کی میں اُس کے لطافت بیاں کروں تب دل نچنت[1] ہووے جو ٹھہرے نظر کہیں
جاتے ہیں سر کے بال جو دوڑے ہوئے اُدھر شاید ملا ہے ان کو سراغِ کمر کہیں
بے چارہ قیس نجد کی وادی میں ہے خراب ناقہ نکل گیا ہے مگر بیشتر کہیں
اب تک حنا لگی ہے اُسے بہرِ رفعِ سوز پانو اس کا پڑ گیا تھا مری قبر پر کہیں
اپنا تو طولِ عمر سے گھبرا گیا ہے جی گھر پہنچیں ہم، تمام بھی ہو یہ سفر کہیں
گزرا جوابِ خط سے میں قاتل کے، مصحفی
لے کر کے جان اپنی پھرے نامہ بر کہیں

86

مُو پشتِ لب سے یار کے جب تک نمو کریں مضمونِ تازہ ہم بھی کوئی جستجو کریں
آنکھ اُس سے مشتری کی جھپکتی ہی جائے ہے وہ دھکدھکی[2] کو اپنا نہ زیبِ گلو کریں

1۔ نچنت: (ہ) بے فکر 2۔ ایک زیور

قاتل کشیدہ تیغ ہے سر پہ کھڑا ہوا ہم اب تو دل سے رخصت ہر آرزو کریں
مژگاں زدن سے کم ہے زمانِ نمازِ عشق ہو جاوے فوت وقت ہی جب تک وضو کریں
ہم صحبتانِ بد سے کبھو ہو نہ فائدہ کانٹے نہ گل کے چاکِ گریباں رفو کریں
مدح و ثنا میں تیری خموشی ہی خوب ہے کیا وصف کر کے ہم تجھے اپنا عدو کریں
حیرت نے تیرے حسن کی ہم کو کیا ہے لال اب انگلیوں سے چاہیے ہم گفتگو کریں
بھوکے کی گور سے نہ رکھیں کام کاسہ گر خاکِ شکم پرست کو صَرفِ سبو کریں
حاصل مقلدوں سے نہ ہو مدعائے دل کاغذ کے پھول کو نہ سنا میں کہ بو کریں
اُٹھ جائے یار ہو کے خفا گر شبِ وصال تا صبح دم ہم اس کے ہی تکیے کو بو کریں
آنکھیں دوچار چاہئیں، مذہب میں عشق کے مجرم ہوں زیرِ تیغ جو ہم سر فرو کریں
سن کر اُٹھوں گا آپ میں دیوانہ خواب سے لڑکے تو میری قبر پر آ کر غلو کریں
مر جاؤں میں جو اس کی گلی میں تو کیا عجب قدوسیاں کفن کی مرے شست و شو کریں
پھر باز پرسِ حشر بروزِ دگر کھنچے صورت تری جو واں بھی مرے روبرو کریں
بس ہے یہ جرمِ عشق کی تعزیر مصحفی
تشہیر میری نعش بتاں کو بہ کو کریں

87

مذہب کی میرے یار اگر جستجو کریں مرتے ہوئے مرا نہ سوے قبلہ رو کریں
تھا میں شراب دوست بہت، میری خاک کے کاسے بنانے[1] چاہئیں کچھ، کچھ سبو کریں
مذکور میرے گریے کا ہو جس جگہ وہاں اہلِ نماز جاے تیمم وضو کریں
بانگِ ذبیح ہو نہ کبھی آشنائے گوش کیونکر ترے شہید فغاں بے گلو کریں
گر تو سنے تو سلسلۂ زلف کے اسیر شرحِ نیازمندیِ دل مو بہ مو کریں
اُس کے دہانِ تنگ میں جاے سخن نہیں ہم گفتگو کریں بھی تو کیا گفتگو کریں

1۔ اصل: کاسے بناویں چاہیے۔

طالب ہیں دل سے حسنِ محبت فزا کے ہم　　اس سے زیادہ اور تجھے خوبرو کریں
زنداں میں اس کے ہیں تو کئی بے گنہ اسیر　　غالب کہ روزِ عید انھیں سرخرو کریں
دعوے میں تیرے عشق کے صادق نہ ہو سکے　　شرمندگی سے کیونکہ نہ ہم سر فرو کریں
چرخِ ہزار رخنہ کا پیوند کیونکہ ہو　　یہ شال وہ نہیں ہے کہ جس کو رفو کریں
سوزن سے ایک خار کی دیوانگانِ عشق　　چاکِ جگر سئیں کہ گریباں رفو کریں
کھلوادو اُن کی فصد کہ دیوانے ہیں وہ شخص　　جو فصلِ گل میں میرا گریباں رفو کریں

یہ چاہیے ہے ہم کو کہ ہم سب سے مل چلیں
اے مصحفی کسی کو نہ اپنا عدو کریں

88

میں وہ نہیں کہ شکوۂ گردونِ دوں کروں　　آوے کچھ اُس کا ذکر تو خود سرنگوں کروں
کُٹنا[1] ہوں میں بھی وہ کہ مری جنسِ دل کو دیکھ　　گاہک جو رنجھ جائے تو قیمت فزوں کروں
مجنوں کہانی اپنی سناوے اگر مجھے　　سن سن کے چپ رہوں میں نہ ہاں اور نہ ہوں کروں
مجھ سے شبِ فراق میں کیا ہووے گا مگر　　مانندِ شمع گریہ بہ حالِ زبوں کروں
آخر ملی ہے بزمِ حسیناں میں جا مجھے　　آئینہ ساں جو صاف دروں و بروں کروں
ساغر نہ لوں میں رشک بھرا اس کے ہاتھ سے　　پی پی کے خونِ دل، دلِ ساقی کو خوں کروں

کیوں ہی یہ مفلسی بھی تو کٹ جائے مصحفی
منھ پر طمانچے[2] مار کے رخ لالہ گوں کروں

89

کشتگانِ ناز کی جب اس کے قبریں پٹ گئیں　　دفن کر ان کو چہل قدمی کو حوریں ہٹ گئیں
جی میں سورج کے نہ آیا دیکھ لوں میں ان کو ٹک　　پانی بھرنے جاتنیں جب شام کو پنگھٹ گئیں

1۔ یہاں ''کہتا، کتنا'' وغیرہ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ''کُٹنا'' بمعنی فریبی زیادہ قرین قیاس ہے۔

2۔ اصل: طپانچے

اس قدر کافر کُشی پر باندھی ہیضے[1] نے کمر — سیکڑوں ہندو موئے، سوار تھیاں مرگھٹ گئیں
ترکِ غمزہ نے کیا اس کے جو آ کر اہتمام — عاشقوں کی تھیں جو اس کوچے میں بھیڑیں چھٹ گئیں
تیغ رانی کا کروں ابرو کی اس کے کیا میں وصف — انگلیاں دیکھے سے جس کی آب داری، کٹ گئیں
منھ سے پردہ اس طرح تجھ کو اُٹھا دینا نہ تھا — دیکھتے ہی رخ ترا جانیں بہت چٹ پٹ گئیں
تشنگاں کی اُس کے روحیں بزم میں آئیں جو رات — سو صراحی مے کی وہ یکبار پی غٹ غٹ گئیں
خواب میں میلا نہ دیکھا تھا کبھی جن کا کفن — ہو کے گل در گل وہ لاشیں گرد میں سب اَٹ گئیں
خوب شیون نے محرم کے رچھایا اب کے سال — محر میں کیا کیا زنانِ سینہ زن کی پھٹ گئیں
لطف کیا جینے کا اس کے رہ گیا پھر اے مسیح! — منھ میں جس بیمار کے اُڑکھیاں سٹ سٹ گئیں
خیمۂ تن کے تو گرنے کا تعجب کچھ نہ کر — جب اجل آئی طنابیں زندگی کی کٹ گئیں
میں ہی کچھ باریک تر از مو نہیں آیا نظر — ہجر میں تیرے مری راتیں بھی پیارے! لٹ[2] گئیں
روزِ محشر بھی نہ چوکیں عاشقوں کی آنکھیں یاں — ان کو جس کروٹ سُلایا سو وہ اُس کروٹ گئیں
جا ملیں حورانِ جنت سے وہیں وہ بیبیاں — چومنے ابنِ علی کے در کی جو چوکھٹ گئیں

حسرتیں باقی جو میرے دل میں تھیں اے مصحفی
آخر آخر اینٹ کا گھر کر کے وہ چوپٹ گئیں

90

کٹ گئی ہیں جاگتے شب ہائے ہجراں سیکڑوں — چھڑکے ہیں ایک زخم پر میں نے نمکداں سیکڑوں
گر سفارش کی کسی نے میری، اُس سے یوں کہا — پھرتے ہیں گلیوں میں ایسے مو پریشاں سیکڑوں
جب دکھایا ہے جنونِ عشق نے اپنا کمال — اُڑ گئے ہیں دھجیاں ہو کر گریباں سیکڑوں
محوِ آرائش ہو کیا ان کی بھی ٹک رکھیو خبر — پیستے ہیں جو مسّی پر لب کی، دنداں سیکڑوں
گریہ آنسو ہیں تو لاکھ آویں گے دریا جوش میں — گریہ آنکھیں ہیں تو دکھلاویں گی طوفاں سیکڑوں
کب سے ہے تختہ زمیں کا تخت گاہِ خسرواں — اُٹھ گئے ہیں بیٹھ کر اس پر سلیماں سیکڑوں

1۔ اصل: حیضہ 2۔ اصل: کٹ = لٹنا بمعنی کمزور ہونا

وہ صنم آیا بہ ربِ کعبہ کل مجھ کو نظر دیکھ جس کو ہو گئے ہندو مسلماں سیکڑوں
جس کو مارا ہے تری برسات کی مہندی نے جاں اُگتے ہیں تربت سے اس کی نخلِ مرجاں سیکڑوں

موسمِ باراں میں تو تھے مصحفی مختل حواس
سوجھ گئے مضموں ہمیں فصلِ زمستاں سیکڑوں

91

سخن میں کامرانی کر رہا ہوں ضعیفی میں جوانی کر رہا ہوں
غرورِ نقشِ اول پیش کیا جائے میں کارِ نقشِ ثانی کر رہا ہوں
نہ سمجھے گا کوئی مجھ کو پیمبر عبث دعوائے ثانی کر رہا ہوں
اجل تو ہی سبک کر مجھ کو آ کر دلوں پر میں گرانی کر رہا ہوں
دلِ معشوق پتھر ہے تو ہووے میں اس کو پانی پانی کر رہا ہوں
تصور ہے کہاں مجھ پاس تیرا میں خود باتیں زبانی کر رہا ہوں
نہیں پاس اس کے بیٹھا بے سبب میں گلوں کی پاسبانی کر رہا ہوں
کبھی تو بھی تو میرے خواب میں آ میں تیری یاد، جانی! کر رہا ہوں
فرشتے کا گزر اُس تک نہیں ہے میں آپھی بدگمانی کر رہا ہوں

نہیں اے مصحفی فہمیدہ کوئی
عبث جادو بیانی کر رہا ہوں

و

92

[1] جوں ہی زنجیر کے پاس آئے پانو دیکھ اس کو مرے تھرائے پانو
خط کا لایا نہ اُدھر سے وہ جواب یوں ہی قاصد کے میں تھکوائے پانو

1۔ یہ غزل حاشیے پر درج ہے

بدگمانی نہ ہو عاشق کی زیاد اُس نے شب غیر سے دبوائے پانو
ہاتھ سے یار کا دامن دے کر ہر طرف پھرتے ہیں گھبرائے پانو
نجد کا دیکھ کے صحرائے وسیع آتے ہی قیس نے پھیلائے پانو
خوش خرامی ہے صنم! تجھ پر ختم کبک و طوطی نے یہ کب پائے پانو
تُو تو سوتا رہا عاشق نے ترے رات بھر آنکھوں سے سہلائے پانو
مجھ مسافر کے کسی نے ہرگز گرم پانی سے نہ دھلوائے پانو

مصحفی ہم کو طرب سے کیا کام
بیٹھے ہیں گور میں لٹکائے پانو

93

رہنے کو مقرر جو کوئی میرے مکاں ہو تو روزنِ دیوار بھی افعی کا دہاں ہو
میرا تو ہوا ہے لحدِ تیرہ میں مسکن اے یارو! یہ بتلاؤ تم اس وقت کہاں ہو
میں بارِ تعلق کے تئیں[1] خاک اُٹھاؤں جس وقت کہ ہستی ہی مری مجھ پہ گراں ہو
لے جاؤں تصور جو ترا ساتھ لحد میں تربت سے مری چشمۂ خورشید عیاں ہو
جب جذبۂ مجنوں کے پڑی پانو میں بیڑی پھر نجد سے کیونکر قدمِ ناقہ رواں ہو
تیرے لبِ شیریں کا کروں ذکر ہمیشہ چاہوں ہوں کہ طوطی کی مرے منھ میں زباں ہو
بہلانے دل اپنا میں اگر باغ میں جاؤں نیزے کی ہر اک نوک مرے حق میں سناں ہو
آنکھوں کے تئیں موج کا باندھوں ہوں تصور گر یار کی صورت مری نظروں سے نہاں ہو
افلاس جوانی میں مری پڑتے ہیں ہیکل کچھ غم نہیں پیری کا اگر بخت جواں ہو

اے مصحفی جیتے میں، میں تھا بادیِ یاراں
مرقد کا مرے سنگ نہ کیوں سنگ نشاں ہو

1۔ اصل: نہیں

94

ہے وہ بھی سادہ اور صنم تم بھی سادہ ہو
ڈرتا ہوں آرسی سے نہ الفت زیادہ ہو

جاتی ہے لیلیٰ نجد کی وادی میں جب سوار
پاسِ ادب کہے ہے "یہاں سے پیادہ ہو"

مجنوں کا باپ مجنوں کو کعبے میں لے گیا
مانگی دعا یہ الفتِ لیلیٰ زیادہ ہو

وہ کاش بھیج دے مرے خط کے جواب میں
ملفوف کر کے اس کو ہی کاغذ جو سادہ ہو

اللہ رے فراستِ معشوق، آفریں!
جاتا ہے بوجھ وو ہیں جو دل کا ارادہ ہو

دریا پہ دیکھے گا وہ شبِ ماہ کی بہار
بے چوبہ مختصر لبِ دریا ستادہ ہو

دم روے خوش پہ اپنا پھڑک جائے ہے وو ہیں
اس میں کوئی کمینہ کہ اشراف زادہ ہو

پیری میں ہم نہ کھائیں گے زخمِ زبانِ خلق
یہ وہ کماں نہیں ہے کہ جس کا کبادہ ہو

اُن سر گزشتگاں میں ہیں ہم رہروِ فنا
جن کا قدم قدم دمِ شمشیر جادہ ہو

ہم اپنی دوستی سے نہ گزریں گے مصحفی
ہر چند غیر سے اُسے الفت زیادہ ہو

95

مستوں نے کیا طرۂ سر تب سرِ رز کو
پایا جو زمرد کے مقابل پہ رز کو

جو باغ کے انگور تھے ان کے تئیں مے نے
سب صرف کیا دخترِ رز پر زرِ رز کو

خشکی پہ مرے زخم کا انگور نہ آیا
باندھے رہا اس پر جو میں برگِ ترِ رز کو

تب تیغ زباں سان پہ مستوں کے چڑھے گی
جب خم سے نکالیں گے مغاں جوہرِ رز کو

گر پیچ وخم اس کو نہ دیے زلف نے تیری
اتنی شکنیں کس سے ملیں پیکرِ رز کو

کیوں خوشۂ انگور نہ ہو عقدِ ثریا
پاتا ہوں بلندی پہ بہت اخترِ رز کو

وصفِ مئے انگور جو لکھے ہے تو ساقی!
کر صفحۂ گلزار پہ تو مسطرِ رز کو

کس جعدِ مسلسل کا اُسے دھیان بندھا ہے
جو سانپ سے لپٹے ہیں تنِ لاغرِ رز کو

اے مصحفی تو لے نہ زفاف اس کا بہ طفلی
جوبن پہ تو آنے دے ذرا دخترِ رز کو

96

لتے لگ جائے وہ نوکر جو سہ و نو کا ہو
کام کا کچھ نہیں در ماہہ اگر سو کا ہو

گر نہیں نقد سواری ہی معین ہووے
فائدہ کچھ بھی تو انساں کو تگ و دو کا ہو

وہی نعمت ہے جو ہاتھ آئے مرے بھوک کے وقت
موٹھ کا، ماش کا ٹکڑا ہو کہ یا جَو کا ہو

دست بخشش کو نہ رکھ باز تو مانندِ چراغ
سیم[1] سے پھول جھڑیں پر نہ زیاں لَو کا ہو؟

جاتے جاتے وہ تسلی تو مری کر گئے پر
معتبر کیونکہ ہو جو حرف روا رَو کا ہو

کچھ تو دیوے گا خبر چاہ کے سررشتے سے
نامہ بر کیجیے کبوتر جو کوئی کھو[2] کا ہو

یہ بھی قدرت ہے خدا کی اُسے بارہ آویں
منتظر عشق کی چوپڑ میں جو اک پو کا ہو

مصحفی ریختہ کہتا ہوں میں بہتر ز غزل
معتقد کیونکہ کوئی سعدی و خسرو کا ہو

97

شب میں دیکھی ہیں پڑی پانو میں زنجیریں دو
یارو! اس خواب کی تم ہی مجھے تعبیریں دو

پُتلیوں میں ہے ان آنکھوں کی یہ اعجاز نیا
کھینچ لیتی ہیں یہ اک شکل کی تصویریں دو

ابروؤں میں یوں تری بینی نظر آتی ہے
جوں جریدہ پہ کوئی باندھ دے شمشیریں دو

مجھ سوا اور بھی خواہندہ ہوا کیا پیدا
باندھے پھرتا ہے وہ سفاک جو شمشیریں دو

بندِ محرم سے نشاں پشت پہ ہیں اس کی پڑے
مارتی ہیں مجھے چھڑیاں سی یہ تحریریں دو

کیوں نہ بوسے لب و رخسار کے لیوے عاشق
وصل کی شب اسے ہاتھ آئی ہیں جاگیریں دو

پاسباں! تو مجھے جانے تو بھلا دے اُس تک
ابھی پھر آتا ہوں بس کر کے میں تقریریں دو

تازیانہ ہو کہ تپچی ہو کہ لاٹھی پانی
ہوں گنہگار جو کچھ چاہیے تعزیریں دو

1۔ قیاس سے لکھا گیا۔ اصل میں "شیم" ہے۔ 2۔ چاہ کی رعایت سے "کھو" ہی ہو سکتا ہے۔

ایک جلوت کے لیے ہے، تو ہے خلوت ایک سوچ کر اس نے بنائی ہیں یہ تعمیریں دو
کوئی دیوانہ جو بن جائے تو کوئی دانش مند اب کے گلشن کی ہوا رکھتی ہے تاثیریں دو
یا تو ے پیچے یا گھورے محبوبوں کو ہم کو خوش آتی ہیں اے دل! یہی تقصیریں دو
جو کہ پیشانی میں لکھا ہے وہی ہوتا ہے نہیں ہوتیں کبھی اک شخص کی تقدیریں دو
نہیں فرہاد کہ دشمن کے تئیں جاویں چھوڑ ہم اگر چاہیں تو اک تیشے میں سر چیریں دو
اک دل آزادہ نہ تھا جب کہ پڑی رہتی تھیں چاندی سونے کی گلے میں ترے زنجیریں دو
زہر ہی کھایئے یا حلق پہ رکھ دیجے چھری ہجر میں موت کی سوجھی ہیں یہ تدبیریں دو
مصحفی ملکِ عدم اتنا تو کچھ دور نہیں
ابھی جا پہنچے گر کیجے شب گیریں دو

98

شعر کیا جس میں نوک جھوک نہ ہو مرغ پھر کیا لڑے جو نوک نہ ہو
کہیں دیکھے ہیں سادہ رو، خونخوار چشمۂ آئنہ میں جوک نہ ہو
وہی کوچہ بھلا کہ جس میں کبھو دندنالوں کی روک ٹوک نہ ہو
نام گردوں پہ جس کا ہے پروین نیشکر کا یہ اُس کے پھوک نہ ہو
رنڈی بازی وہ کیا کرے پھر خاک پاس جس کے کتاب کوک نہ ہو
گلہ باید حریصِ شہوت را ایک بکری سے شاد بوک نہ ہو
پیٹ کا بھاڑ ہے بلا نہ بھرے خوب تا اس میں جھوکا جھوک نہ ہو
حسن مطرب ہے سن کے گانے کا پیشہ لے جب گلے میں ڈوک نہ ہو
کیا پھکیتی کا وہ کرے دعویٰ
مصحفی یاد جس کو روک نہ ہو

99

در تلک جانے کی ہے اُس کے مناہی ہم کو اپنی بس اب نظر آتی ہے تباہی ہم کو

روز جوں توں کہ ہوا شام تو پھر بہرِ عذاب نظر آئی شبِ ہجراں کی سیاہی ہم کو
ہم تو جانے کا ارادہ نہیں کرتے لیکن وہ کمر سوے عدم کرتی ہے راہی ہم کو
کیوں ترے چاہِ زنخداں کا نہ نظارہ کریں جی سے بھاتا ہے بہت سبزۂ چاہی ہم کو
دام بردوش ہی مخلوق کیا خالق نے طاقت اُڑنے کی نہ دی جوں پرِ ماہی ہم کو
پردہ پڑتا جو نہیں اُس سے خوش اندامی پر پیارا لگتا ہے ترا کرتۂ لاہی ہم کو
عمر بھر شعر کہے ہم نے پہ تو نے اے عشق نہ تو مُحزنی ہی کیا اور نہ آہی ہم کو
مصحفی علمِ لغت سے ہے جنھیں آگاہی
جانتے ہیں وہ ابونصر فراہی ہم کو

100

اپنی کشتی کی خوش آتی ہے تباہی ہم کو تا نہ پیش آئے لحد کی تو سیاہی ہم کو
رخصتِ شرم یہی ہے تو صنم دس دن میں مار رکھے گی یہ برگشتہ نگاہی ہم کو
ایک تو بختوں جلے آپ ہیں ہم تس پر اور آگ دیتا ہے لگا محرمِ لاہی ہم کو
کاٹ کاٹ اپنے ہی ہم گوشت کو کھاتے ہیں طبیب نہ تو حلوان ہے درکار، نہ کاہی ہم کو
جوں خطِ سبز نہ نازاں ہوں سیہ موئی پر کشورِ حسن کی ہاتھ آئی ہے شاہی ہم کو
ہم سے مت مے کشیِ شب کا کر انکار، سرک رنگ رخ کا ترے دیتا ہے گواہی ہم کو
مصحفی ایسی بھی چاہت کا میاں منھ کالا
جس نے بدنام کیا خواہی نہ خواہی ہم کو

101

مکھ پھاٹ منھ پہ کھائیں گے تلوار ہو سو ہو دبنے کے بھی تو اُس سے نہیں یار ہو سو ہو
جانا مجھے بھی اب طرفِ یار ہو سو ہو یا بولے یا بتائے وہ دھتکار ہو سو ہو
صیاد کو تو خوابِ تغافل سے کام ہے احوالِ طائرانِ گرفتار ہو سو ہو
سودائی بن کے اس پہ مجھے ہاتھ ڈالنا ہنگامہ اس میں جو سرِ بازار ہو سو ہو

جی پر یہی ٹھنی ہے تو آج اُس کو چھیڑ کر کھائی مجھے بھی گالیاں دو چار ہو سو ہو
گو اس میں ہاتھا پائی بھی ہو جاوے ڈر نہیں لوں گا میں اس کا بوسۂ رخسار ہو سو ہو
مجھ کو بھی کاٹنی قفس اپنے کی تیلیاں یا ٹوٹے یا بچے مری منقار ہو سو ہو
شکوہ کبھی نہ یار کا لاویں گے منھ پہ ہم ہم پر جفائے چرخِ ستم گار ہو سو ہو
اپنی شفا کو اپنے خدا پر تو چھوڑ دے آخر تو موت ہے دلِ بیمار ہو سو ہو
گھر خالصی لگے کہ پڑے پانو کاٹھ میں چوری کریں گے اس کی شبِ تار ہو سو ہو
مانی شبیہِ یار پہ مت آپ کو مٹا لوں گا بنا میں تجھ سے جو تیار ہو سو ہو
اے دل! تو سادہ رویوں کی پھکی میں آنہ جا اک دن لپٹ کے چھین لے تلوار ہو سو ہو
سر پھوڑ کر کے جائیں گے اُس کی گلی میں ہم رنگیں گے خون سے در و دیوار ہو سو ہو
صنعاں کی طرح اک بُتِ کافر کے عشق میں کافر ہو باندھنا ہمیں زنار ہو سو ہو
لینی متاعِ حسن ہمیں اس میں، تاجرو! نقصانِ جان و مالِ دلِ زار ہو سو ہو

شوخی ہے تیری طبع میں شدت سے مصحفی
لے بھاگ سر سے شیخ کے دستار ہو سو ہو

102

جب دکھاتے ہیں تری نرگسِ فتاں مجھ کو پیاری پیاری تری یاد آتی ہیں مژگاں مجھ کو
زندہ مت جان تو اے گردِ خراماں! مجھ کو تیرا حیراں ہوں، سمجھ صورتِ بے جاں مجھ کو
جب تو ہنستا ہے تو یوں سوجھ مجھے پڑتی ہے زہر دیویں گے یہ الماس سے دنداں مجھ کو
مرتے مرتے اُسی بُت کا مجھے کلمہ پڑھنا اس میں کافر کوئی سمجھے کہ مسلماں مجھ کو
منھ چھپانے کا یہ اسلوب نہیں ہوتا ہے مان کہنا، نہ ستا او بُتِ ناداں مجھ کو
طالع طبق میں شاید کہ ہوا میں پیدا جو جلاتی ہی نہیں آتشِ سوزاں مجھ کو
یہ بھی آرایشِ کاکل کا بھلا ہے کوئی ڈھنگ شانہ کرتا ہے اُسے جمع، پریشاں مجھ کو
خوگرِ آتشِ دوزخ ہوں کہ ہوں موسیقار میں نہ لوں مفت جو دیں روضۂ رضواں مجھ کو

دم میں جو چاہے سب اسباب مہیا کر دے　　جس نے مخلوق کیا باتنِ عریاں مجھ کو
یار ہے گرچہ شب و روز بغل میں میری　　چھوڑتی تو بھی نہیں حسرت و حرماں مجھ کو
شدتِ طول سے تیری یہ یقین پڑتا ہے　　مار کر جائے گی تو اے شبِ ہجراں مجھ کو
وحشتِ عشق بُرا ہووے ترا، او کافر　　تو پھراتی ہے بیاباں بہ بیاباں مجھ کو
گلشنِ وصل سے آمد نے خزاں کی ہے ہے　　پھول چننے نہ دیے ایک بھی داماں مجھ کو
قتل ہوں یا کہ نہ ہوں پر ہے خدا سے یہ امید　　زندگی پھر بھی ملے مثلِ شہیداں مجھ کو
صبح ہوتی ہی نہیں جس کی شبِ تیرہ ہنوز　　کیسے صحرا میں ہوئی شامِ غریباں مجھ کو
خواب میں یار تو آیا تھا میں بوسہ نہ لیا　　کھل گئی آنکھ یہی رہ گیا ارماں مجھ کو
لیتے کروٹ ترے مژگاں جو مجھے یاد آئے　　تار بستر کے ہوئے خارِ مغیلاں مجھ کو
جی کو میں شاد تو کرتا ہوں و لے تیرا خیال　　غم سے رکھتا ہے سدا دست و گریباں مجھ کو
صبر کرنے کا تو یارا ہے کروں پر کیونکر　　چین دیتی نہیں وہ جنبشِ مژگاں مجھ کو
مان کہنے کو، رِہا کر نہ قفس سے صیاد　　کہ نہیں طاقتِ پروازِ گلستاں مجھ کو

سوے مقتل لیے جاتا ہے مرا جذبۂ عشق
مصحفی جان کے ننگِ درِ زنداں مجھ کو

ہ

103

دل میں مرے جو یار کی الفت گئی ہے بیٹھ　　سر کو پکڑ کے اپنے محبت گئی ہے بیٹھ
داد و دہش سے اب کے امیروں کے بوجھ سے　　ہمت گئی ہے اُٹھ تو مروّت گئی ہے بیٹھ
طے ہو سکے گی کب رہِ دور و درازِ عشق　　اپنی تو دو ہی گام میں طاقت گئی ہے بیٹھ

تصویر دیکھنے مرے یوسف کی ماہِ مصر
مانی کے پاس آ کے بہ رغبت گئی ہے بیٹھ

بارش سے سیلِ اشک کی یہ کیا ستم ہوا
دیوارِ خانہ اپنی بہ شدت گئی ہے بیٹھ

مت پوچھ حال اس کا صنم! آرسی کی آنکھ
جب سے نہاں ہوئی تری صورت گئی ہے بیٹھ

جب رقص کو اُٹھا ہے وہ مجلس میں کر بناؤ
حورِ بہشت پا کے خجالت گئی ہے بیٹھ

چاہا ہے یوں تو ہم نے ہزاروں کو پر تری
دل میں ہزار طرح کی چاہت گئی ہے بیٹھ

میں وہ فقیر ہوں کہ جو آیا ہوں طیش میں
سر پر عدو کے تیغِ کرامت گئی ہے بیٹھ

کیونکر کوئی نکالے کہ اس کینہ ور کے ہائے
میری طرف سے جی میں عداوت گئی ہے بیٹھ

ممنوں ہوا نہ ماہِ محرم کا مصحفی
ہر چند اس غریب کی تربت گئی ہے بیٹھ

104

خود وہ جسمِ سادہ ہو جب پیرہن میں آئنہ
آئے پھر کس منہ سے اس کی انجمن میں آئنہ

قدرِ عاشق کم نہیں ہوتی کچھ اتنے میں کبھی
گر دو ساعت اوٹ ہووے مرد و زن میں آئنہ

صورتِ انجام کار اس میں نظر آتی تھی صاف
تیشہ تھا جب تک کہ دستِ کوہکن میں آئنہ

اب نہ اُس کی زلف کی وہ چیں نہ وہ رخ کی صفا
قدر رکھتا تھا کبھی چین و ختن میں آئنہ

خجلت ایسی ہی ہوئی تھی اس کو تیرے رخ سے رات
گر پڑا پھر کیوں نہ اس چاہِ ذقن میں آئنہ

واں بھی خدمت گاریِ خوباں نہ پیش آوے کہیں
بعدِ مردن رکھیو تم میرے کفن میں آئنہ

اُس کو جب پیدا ہوئی تھی راہ اپنے حسن سے
بیچ تکیے کے رہے تھا سادہ پن میں آئنہ

ہم نے جانا ایک دن اس پر بھی آوے گی شکست
دیکھ کر دستِ بُتِ پیماں شکن میں آئنہ

صورتِ عالم رہے گی نو بہ نو اے مصحفی
مہر کا ہے تا کفِ چرخِ کہن میں آئنہ

ی، ے

105

مہ، داغ دل پہ، دیکھ کے تعویذ، دست کھائے
عقدِ گہر پہ خوشۂ پرویں شکست کھائے

تا دیر و کعبہ سیر کیا، آگے دیکھیے
کیا کیا فریب دیدۂ صورت پرست کھائے

رخصت دے باغباں کہ یہ آوارہ بیٹھ کر
اک دم ہوا چمن کی تہِ دار بست کھائے

ہوتا نہیں وہ دیدۂ خمار میں عزیز
دھولیں شراب خانے کی جب تک نہ مست کھائے

فکرِ کفک میں اس صنمِ دلفریب کی
تا چند خونِ دل، دلِ حرماں پرست کھائے

ٹک پاس رکھیو صورتِ شیریں کا کوہکن
آہن سے تیشے کے نہ شرر کوئی جست کھائے

کہہ دوسری غزل بھی یہ ہے شرط مصحفی
جو قافیہ ہو وضع پر اپنی نشست کھائے

106

رنگِ حنا سے اس کی شفق روئے دست کھائے
جوشن کے بانکپن سے مہِ نو شکست کھائے

آوے گلاس مے کا تو یاں پشتِ دست کھائے
چینِ جبیں سے کاسۂ چینی شکست کھائے

بوسہ کبھی تو اپنے خطِ پشتِ لب کا دے
پستے کی کیا گزک نہ ترا مے پرست کھائے

مجھ بادہ کش کی روح تو تا بنے کبھی
خوشے کُتر کُتر کے سرِ دار بست کھائے

کیا دل کو میں کروں سپرِ ناوکِ بلا
جب پُشتِ کوہ قاف سے یہ تیر جست کھائے

اے کاش باغِ وصل میں یہ کم نصیب بھی
چن چن کے میوے کو زسرِ شاخ پست کھائے

کیونکر نہ ہو شکار یہ قسمت کا پیچ ہے
چارہ سمجھ کے ماہی جو دریا میں شست کھائے

شہد و شکر زباں پہ نہ رکھے بہ آرزو
گر زہر دو تو شوق سے مستِ الست کھائے

آزادگاں کا اور ہی مشرب ہے مصحفی
درویش وہ نہیں کہ غمِ نیست ہست کھائے

107

رخِ گل کا پشتِ پا سے ترے پشتِ دست کھائے
ایڑی کو دیکھ پاشنہ خانم شکست کھائے

شانے سے کیوں نہ زلف تری پشتِ دست کھائے
جو سرکشی کرے وہ مقرر شکست کھائے

رخ کی صفا سے دانۂ گوہر شکست کھائے
پنجوں کو دیکھ اُس کی پری پشتِ دست کھائے

ہے چاہ کا مزہ بھی یہی کیا مضایقہ
خوباں کی گالیاں جو نہ شاہد پرست کھائے

دامن فشاں نہ قبر پہ عاشق کی تم پھرو
ایسا نہ ہو کہ اُس سے کوئی شعلہ جست کھائے

تلخی سے زندگی نہ کرے کیا ضرور ہے
تھوڑا سا زہر ہی دلِ حرماں پرست کھائے

ہو اور اُس سے خوب رسا نشۂ سرور
ابرو ہوا میں پوست کی پتی جو مست کھائے

ہے پاسِ نازکی اُسے اتنا کہ شانے میں
مشاطہ کوٹی جاوے اگر اک مو شکست کھائے

چوٹی کے بال جوڑے میں کس طرح بندھ گئے
کیونکر گرہ بلند سے مضمونِ پست کھائے

مستِ شراب ہوں میں روا رکھ نہ باغباں
میمون باغ خوشۂ ہر دار بست کھائے

تابِ فراقِ یار نہیں مصحفی کو اب
ڈرتا ہوں سنکھیا نہ یہ مبہوت دست کھائے

108

انجن جو آنسوؤں کا مرے روپ جست کھائے
ہر شعلہ بند آگ پہ آخر نشست کھائے

نیرنگِ حسن کا ترے مضموں جو بست کھائے
پھر جائے منھ گلوں کا، ہزار اشکست کھائے

لطمے کے شور سے وہ برابر نہ ہو سکے
دریا میں پیچ و تاب پڑی، موجِ پست کھائے

بھوکا نہ ایسا باغ میں آوے کوئی کہ وہ
خوشے تمام ہوویں تو پھر دار بست کھائے

جس کو نہ ایک لونگ چھڑی پر ہو دسترس
لحم اپنا کاٹ کاٹ نہ وہ فاقہ[1] مست کھائے؟

1۔ اصل: ناقہ مست

قحطے سے گاؤ دنبہ میں چربی نہیں رہی کیا لقمہ ہائے چرب کوئی مے پرست کھائے
بے قیدِ عشق صلح کرے میش گرگ سے کھائی، گڑھا نہ اور نہ غمِ خار پشت کھائے
موسیٰ کا رنگِ نور تجلی کچھ اور تھا
شعلے سے دھوکا اس کا نہ آتش پرست کھائے

109

جو آج نظر آئے ہے افسانہ ہے یہ بھی آبادی پہ مت بھولو کہ ویرانہ ہے یہ بھی
اے کاش کوئی شمع کے لے جاکے مجھے پاس یہ بات کہے اُس سے کہ پروانہ ہے یہ بھی
کنجشک دلِ عاشقِ مسکیں کو مسلنا آگے ترے اک بازیٔ طفلانہ ہے یہ بھی
گل چہرہ بتوں کا ہے تصور مرے دل میں تم سیر کو آؤ تو پری خانہ ہے یہ بھی
مے عمر کے ساغر کی چھلک جاتی ہے جلدی کم ظرفی تو دیکھو کوئی پیانہ ہے یہ بھی
مت پنجۂ عاشق سے چھڑا کاکلِ مشکیں اک عاج کا شانہ ہے تو اک شانہ ہے یہ بھی
مجنوں نے تصور کبھی ناقے کا نہ چھوڑا واللہ عجب طرح کا دیوانہ ہے یہ بھی
گو دل کے تئیں محرمِ راز اُس کا کیا تھا پر خوب جو سوچا میں تو بیگانہ ہے یہ بھی
تم جوہری ہو اس کے میاں اشک کی میرے گر قدر کرو گوہرِ یک دانہ ہے یہ بھی
تم رہنے لگے صحبتِ اغیار میں پہروں یاری تو نہیں کی کوئی یارانہ ہے یہ بھی
جو ریختہ کہنے کی کئی طرز ہیں اُن میں
اے مصحفی اک وضعِ حریفانہ ہے یہ بھی

110

کر کے جب سیرِ باغ نکلے ہے کیا وہ گل خوش دماغ نکلے ہے
روزنِ خانۂ اسیراں سے کم شعاعِ چراغ نکلے ہے
خاکساری کے ملک کا رستہ سوے ملکِ فراغ نکلے ہے
سینہ کاوی جو میری کرتے ہیں داغ کے نیچے داغ نکلے ہے

دُردنوشوں کے واسطے مئے صاف خم سے بھر بھر ایاغ نکلے ہے
چھا گئی ہے جہاں میں تاریکی شب کو گل ہو چراغ نکلے ہے
اس کو رکھیں جو ماکیاں کے تلے بیضۂ بط سے زاغ نکلے ہے
مصحفی گرچہ ہے فقیر مزاج
تو بھی اس میں دماغ نکلے ہے

111

عکس کو طالبِ نظارہ جو پایا تو نے آرسی کو بھی صنم منھ نہ لگایا تو نے
خوابِ آرام میں سوتا تھا وہ گل، قہر ہوا اے نسیمِ سحری کس کو جگایا تو نے
کشتہ اس لطف کا ہوں میں کہ جب آئی شبِ وصل اپنا خنجر مرے پہلو میں سُلایا تو نے
جستجو میں تری ہر کوچہ پھرا آوارہ منھ چھپا کر مجھے دیوانہ بنایا تو نے
ناصحا! فکرِ رفو کاریِ چاکِ دل کر فائدہ کیا جو گریبان سلایا تو نے
بوسہ لینے کو ترا شیشۂ مے آیا تھا خوب سمجھا کہ اُسے منھ نہ لگایا تو نے
ہوگئے اتنی نوازش میں گنہ سارے عفو کہ جنازے کو مرے ہاتھ لگایا تو نے
روح یاں تک ہوئی خوش میری کہ تربت میں صنم مجھ کو گاڑا نہیں، اک مردہ جلایا تو نے
مصحفی عشقِ نہاں کا تو یہ اسلوب نہ تھا
کھا کے گل اپنے جو پہنچے کو جلایا تو نے

112

مجھ سبک روح کو کیا خانۂ زنداں روکے نکہتِ گل کو نہ دیوارِ گلستاں روکے
وادیِ نجد میں آپہنچے ہیں ہم اب، مجنوں اپنے رہنے کو جدا چاہیے میداں روکے
ہجر کے بعد مزہ وصل کا کب ملتا ہے آپ کو تا کہ نہ دو چار دن انساں روکے
باغباں سے کوئی کہہ دو کہ لٹا جائے ہے باغ باڑھ کانٹوں کی بہ گردِ چمنستاں روکے
زعفراں سے بھی زیادہ ہے مری زردیِ رنگ کس طرح اپنی ہنسی کو لبِ جاناں روکے

رفتنی تھے نفسِ چند جو سینے میں مرے — مر گئے گرچہ بہ صد حسرت و حرماں رو کے
ہنس دیا اُس نے غضب میں مری عیاری دیکھ — تازیانے جو میں اُس کے سرِ میداں رو کے
شہر میں خون بہت ہوتے ہیں کہ دو چند رہے — نگہِ ناز کو وہ نرگسِ فتاں رو کے
یار روتے رہے سب، روح نے پرواز کیا — کیا مسافر کے تئیں شدتِ باراں رو کے
میں نے بھر بھر کے دمِ سرد کیا دل ٹھنڈا — تا نہ اُس کو تپشِ سینۂ سوزاں رو کے
شیر چلتے ہوئے آوے جو نظر رستم کو — بیچ رستے کے تری جنبشِ مژگاں رو کے
قبر کا گھر بھی عجب گھر ہے کہ جس کے در پر — گبر ہی ہاتھ کو کھینچے، نہ مسلماں رو کے
گر رہوں شہر میں، ہو دود کے باعث خفقاں — جاؤں صحرا کو تو دم گردِ بیاباں رو کے
شب کو قرآن پڑھا کر کہ نزولِ آفات — ہووے گر گنبدِ نیلی سے تو قرآں رو کے
کیوں نہ اُس ہاتھ کی مہندی پہ سیاہی آوے — اُس نے جس ہاتھ سے سو سینۂ سوزاں رو کے
تاب کیا اُس کی جو ہو یار کی نتھ پر چسپاں — جھوک بالی کی تری گوہرِ ''غلطاں'' رو کے

مصحفی جو ہوا[1] مجرائی خاصِ درِ عشق
کیا اُسے دبدبۂ مسندِ سلطاں رو کے

113

بھولی ہے راہ میرے کبوتر نے بام کی — ڈرتا ہوں ہو نہ گرم بغل اس سے دام کی
منزلت نشینِ راہِ فنا جو ہوئے ہیں آہ — اُن سے خبر نہ پوچھ تو کوچ اور مقام کی
کس آفتاب چہرہ کے رخ سے اُٹھا نقاب — پاتا ہوں نورِ صبح سیاہی میں شام کی
معشوقِ نوجوان کو لازم ہے سرکشی — راکب سے تھم سکے نہ عناں اسپِ خام کی
گردش سے کب زمانے کی آزاد ہم ہوئے — کس روز دورِ چرخ نے مدت تمام کی
شبنم کے ساتھ رنگِ رخِ گل بھی اُڑ گیا — باغِ جہاں میں کون سی صورت قیام کی
کشتے کو تیرے ہم بھی کھڑے ہو کے دیکھ لیں — چھٹ جاوے بھیڑ خلق کے گر ازدحام کی

1۔ اصل: ہوئے

پگڑی لگے بنانے وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھے | یعنی کہ ایک یہ بھی ادا ہے سلام کی
ان قافیوں میں بس کہ نہ تھا رنگ مصحفی
اک خونِ دل سے میں یہ غزل انصرام کی

114

مسدود ہے جو راہ پیام و سلام کی | چٹھی بھی ہم نہ بھیج سکے تیرے نام کی
ڈر ہے نگاہِ گرم سے میری پگھل نہ جائے | ساعد ڈھلی ہوئی ہے تری سیمِ خام کی
ہیں زور پر چڑھی ہوئی اس سال بلبلیں | کیا موسمِ بہار میں پروا ہے دام کی
ہمسایگی کا یار کی تب لطف ہے کہ ہو | بام اپنے سے ملی ہوئی رہ اس کے بام کی
اپنے وطن کی رسم پہ چسپاں ہے اپنا دل | گھنڈی میں گو نہ ہووے کساوٹ بطام کی
اللہ رے یہ کثرتِ[1] امواتِ ہندواں | آتی ہے ہر گلی سے صدا رام رام کی
کلیاں رکھی ہیں لالے کی اس گل نے زلف میں | ہے دیدنی بہار چراغانِ شام کی
کس پُرتُنہ کو اُس میں ہوا حکمِ منعِ دخل | کنڈی لگی ہے جو درِ دار السّلام کی
دیوانگانِ عشق سے لیں جس نے ٹکّریں | چھاتی سراہیے اُسی سنگِ رخام کی
میرے شکستِ رنگ کا کیا تم کو ہے خیال | کچھ فکر کیجیے رنگِ حنا کے قیام کی
سروِ سہی قیام گیا تیرے قد سے سیکھ | کبکِ دری نے وضع اُڑائی خرام کی
تجھ سے جدا میں ہوتے ہی دو کوڑی کا ہوا | آقا[2] کے ساتھ ہوتی ہے عزت غلام کی
جانے کا اپنے اب نہ رہا کچھ مزہ کہ ہاے | مجلس میں اُس کی راہ ہوئی ہر کدام کی
رکتا ہے جس جگہ کو کوئی اس کو روک لے | زخشِ قلم کو کچھ نہیں حاجت ریام کی
اے مصحفی سمجھ کے اسے پیجیو میاں
یعنی گلا پکڑتی ہے مے اپنے جام کی

1۔اصل: کسرت (ہر جگہ اسی طرح لکھا ہے) 2۔اصل: آغا

115

دو ہتڑوں کی دھڑا دھڑ جو مار منھ پر ہے قیامت ایک شبِ انتظار منھ پر ہے
مگر کہ وادیِ وحشت سے آئے ہے مجنوں پڑی ہے بالوں میں گرد اور غبار منھ پر ہے
زیادہ لیتی ہے عارض کے بوسے زلف سے وہ تمام کاکلِ مشکیں کا پیار منھ پر ہے
دھویں سے حقے کے عارض ہیں تیرے سوسن زار جو تو بھی دیکھے تو کیا ہی بہار منھ پر ہے
بھلا چھپائے سے چھپتی ہے کوئی زردیِ رنگ جو حال ہے سو مرا آشکار منھ پر ہے
زمینِ جلد سے گزری ہے ناخنوں کی خراش میں کیا کہوں جو ستم میرے یار منھ پر ہے
کسی نے مرکبِ خاکی پہ روح کو نہ لکھا نقاب ڈالے ہوئے یہ سوار منھ پر ہے
چھپاؤں گریے کی چادر میں کیونکہ حالِ زبوں کہ آنسوؤں کی مرے آبشار منھ پر ہے
سدا رُخ اپنا طمانچوں سے لال رکھتا ہوں یہ مفلسی میں بھی میرے بہار منھ پر ہے
کوئی تو داد کو پہنچے گا میری محشر میں کہ خوں ملے ہوئے یہ خاکسار منھ پر ہے
نمود بانکوں میں ہوتی ہے تیرے عاشق کی نگہ کی تیغ کا کھایا جو وار منھ پر ہے
وہ بوسہ لینے سے کس طرح مجھ کو منع کرے حیا کا قفل لگا استوار منھ پر ہے
کھلا ہی جاوے ہے نت گیسوؤں سے چہرۂ یار یہ سچ ہے اُس کا بھی کیا اختیار منھ پر ہے
سوالِ بوسۂ عاشق سے ٹک حذر ہے ضرور کڑی یہ تیغ بہت اے نگار منھ پر ہے
ہلالِ عید نہ سمجھو اسے کہ گردوں کے یہ زخمِ نیمچۂ آب دار منھ پر ہے

طمانچے کھاؤں ہوں اس بت کے مصحفی شبِ وصل
نہ پوچھ جو ستمِ روزگار منھ پر ہے

116

دیر آئنہ اُس کی کف میں ٹھہرے خورشید کہیں شرف میں ٹھہرے
مشہور ہے تیرِ نالہ کا توڑ یہ وہ نہیں جو ہدف میں ٹھہرے
تا دُرِ نجف کا آوے موسم اتنے لیے ہم نجف میں ٹھہرے

ثابتِ قدمِ وفا ہیں وہ شخص — کشتوں کے جو اُس کی صف میں ٹھہرے
دیکھے جو تری صفائے دنداں — موتی نہ کبھی صدف میں ٹھہرے
ہولی کے یہ دن ہیں خاک زاہد — ہنگامۂ نا و دف میں ٹھہرے
مہ دیکھے جو جھائیں تیرے رخ کی — دو کھ اُس کے نہ کیوں کلف میں ٹھہرے
جو ہووے سوارِ ملکِ بردع — کیا کشورِ بے علف میں ٹھہرے

شاعر ہوئے جب سے تازہ پیدا
اے مصحفی ہم سلف میں ٹھہرے

117

باغِ ہستی کی ہوا کیونکہ مجھے راس آوے — گل کو سونگھوں تو ترے ناز کی بو باس آوے
وعدۂ وصل تو جھوٹے ہی کیے جا شب و روز — پر نہ اتنے بھی کہ جینے سے مجھے یاس آوے
مجھ کو اس دشت میں پھینکا ہے جنوں نے تنہا — جس بیاباں میں کبھی خضر نہ الیاس آوے
دیکھنے کو وہ مرے کیونکہ گوارا رکھے — عکسِ آئینہ سے ہر دم جسے وسواس آوے
بازیِ گنجفۂ عشق میں دل سوخت نہ ہو — ایک بھی جیت کا عاشق کو نہ جب تاس آوے
کاش مجروح پڑا ہوں میں سرِ کوچۂ یار — اور وہ ڈبیا میں لے سودۂ الماس آوے
سچ ہے یہ، خوب نہیں اتنی بھی چوسر بازی — کام وہ کرتے ہیں ہم جس سے کہ افلاس آوے
غم کے کھانے نے کیا ہو جسے استسقائی — کیا عجب اس کے شکم پر اگر آماس آوے
چست و چابک میں سحر جاؤں ہوں واں اتنے لیے — چڑھ کے گھوڑے پہ وہ شاید سوئے نخاس آوے
تربتِ سوختۂ عشق نمو دشمن ہے — لاکھ ساون ہوں تو بڑھنے پہ نہ واں گھاس آوے
سرکشی نخلِ جواں کی ہے وبالِ گردن — سرکشی ہی کے سبب خوشہ تہِ داس آوے
دیکھنے دل کے مرے آبلہ ہائے پُر خوں — باغِ جنت سے عجب کیا جو عن الناس آوے

مصحفی دل پہ مرے غم نے بٹھایا ہے یہ ضبط
دخل اس بات کا کیا ہے کہ خوشی پاس آوے

118

روش پہ باغ کی وہ گل جو بے نقاب پھرے — تو آفتابی لیے ساتھ آفتاب پھرے
قناعت اس کی نکلتی ہے واژگونی میں — گدا ہے بحر اگر کاسۂ حباب پھرے
گیا ہے خط تو مرا لے کے نامہ برواں سے — جو بعدِ سال بھی آوے بہت شتاب پھرے
کسی کے ہاتھ تو لگتا نہیں، ہے اک عیّار — کہاں تلک ترے پیچھے کوئی خراب پھرے
نہ منھ دکھانے کی ہرگز جگہ رہے اس کو — گر آرسی سے تری چشمِ پُر حجاب پھرے

جو آوے چرخِ چہارم سے مصحفی عیسیٰ
وہ گرد قبر کے میری پئے ثواب پھرے

119

مری طرف کو رخِ یارِ پُر حجاب پھرے — ہوا زمانے کی یا رب کہیں شتاب پھرے
بدن پہ کھائیں جنوں والے گل، خداوندا! — رت آوے گرمی کی اور موسمِ گلاب پھرے
عذارِ یار میں جب بے نقاب دیکھے ہوں — نہ کیونکہ نظروں تلے ماہ و آفتاب پھرے
خبر جو موحشہ قاصد کی آئی اُس کو سے — کلیجا پکڑے ہوئے ہم بالاضطراب پھرے
مٹا دے تلخیِ ایامِ زیست، اے ساقی! — یہ ذائقہ نہیں ممکن کہ بے شراب پھرے
کھلا سبھوں پہ تردد معاش کا اپنی — جو بحرِ دہر میں ہم صورتِ حباب پھرے
شبِ فراق جو بستر پہ کروٹیں بدلیں — تو ساری رات ہم آتش پہ جوں کباب پھرے
ہمارے سوزِ جنوں میں بھی ہووے کچھ تخفیف — جو رفتہ رفتہ ترا عالمِ شباب پھرے
تسلی ہوتی نہیں تشنگانِ دیگر کی — کسی گلے پہ تو خنجر کی تیرے آب پھرے
جو ہو خواصِ گلِ آفتاب عاشق میں — تو غم نہیں جو رخ اُس کا دمِ عتاب پھرے
گلی میں اس کی جو پہنچے تو دل میں یوں گزرا — ذرا تو بیٹھ کے دم لیں، بہت خراب پھرے
وہ تنگ آ کے مرے چاہنے سے کہتا ہے — الٰہی مجھ سے دل اس کا کہیں شتاب پھرے

کبھی تو مصحفی سے بولو، کب تلک یہ غریب
تمھارے گھوڑے کی پکڑے ہوئے رکاب پھرے

120

مارتے تھے جو غریبوں کے تئیں، پیلے ہوئے
پٹ گئیں قبریں انھوں کی خاک کے ڈھیلے ہوئے

لٹ پٹی دستار میں رکھنے لگے بیلے کے پھول
تم ہماری جان کو اب ایسے البیلے ہوئے

کھیلتا پھرتا ہے لڑکوں میں گلی ڈنڈا وہ شوخ
بیٹھے ہیں یاں جاں بہ کف ہم جان پر کھیلے ہوئے

سچ تو ہے تنگی لگا کرنے اب اپنا حوصلہ
کب تلک جاویں جفائیں چرخ کی جھیلے ہوئے

قطب کی چھڑیوں میں آخر پس گیا اپنا تو دل
خوب جب چاروں طرف سے حسن کے ریلے ہوئے

خوش قدانِ نازک ابرو کی محبت ساتھ تھی
خاکِ مرقد سے ہماری جو بڑے کیلے ہوئے

کس کی یادِ فندقِ پا میں لہو رویا میں آہ
کیوں ورم کر آئیں آنکھیں لال کیوں ڈھیلے ہوئے

بے مربی کوئی نعمت ہاتھ یاں آتی نہیں
خوب سمجھے وے گسائیں کر کے جو چیلے ہوئے

مصحفی مجھ کو نہ جنبش دے سکا پائے خیال
سیکڑوں چھڑیاں بھی آئیں سیکڑوں میلے ہوئے

121

دریغ ہو نہ سکی ہم سے جستجو تیری
پس از فنا بھی رہی ہم کو آرزو تیری

اسی سے غم میں ذرا اپنا جی بہلتا ہے
دھری رہے ہے جو تصویر روبرو تیری

گزارِ نکہتِ گل اپنی بزم میں کیا ہو
کہ رچ رہی ہے دماغوں کے بیچ بو تیری

میں بدگمانی سے گھڑیوں کھڑے ہو سنتا ہوں
کرے ہے راہ میں گر کوئی گفتگو تیری

نگوہی آنکھ کی تیری لگاوٹیں نہ گئیں
بگاڑ دی تھی خدا جانے کس نے خو تیری

تو کامِ دل نہیں دیتا، فرشتے کو تا زیست
خراب رکھتی ہے وضعِ بہانہ جو تیری

جہاں سے حیف ہم آلودۂ گناہ گئے
نہ کام آئی کچھ اے گریہ شست و شو تیری

میں دھو کے دیتا ہوں دھوبی کو اپنا جامۂ خواب
نہ آوے تا اُسے کپڑوں سے میرے بو تیری

اگرچہ شعر تو کہتے ہیں مصحفی سب خوب
پہ دل کو بھاتی ہے کچھ میرے گفتگو تیری

122

آئنہ یار کے جس وقت دوچار آتا ہے
صورتِ عکس پہ بھی مجھ کو تو پیار آتا ہے

دور سے دیکھ کے ہوتی ہے خوشی مجنوں کو
سوے صحرا جو کوئی ناقہ سوار آتا ہے

شست سے اُس کی وہ جانبر نہیں ہوتا ہرگز
تیرِ مژگاں سے جو اُس کے دوچار آتا ہے

کیا اسیروں کی خوشی ہوتی ہے گلشن سے کبھو
تیرا جھونکا جو کوئی بادِ بہار آتا ہے

لاکھ صورت سے اگر اُس کے ہوں تیور میلے
سینہ صافوں کے کوئی دل پہ غبار آتا ہے

پھینک آتا ہے مرے خط کو ترے کوچے میں
نامہ بر بوجھ سا اک سر سے اُتار آتا ہے

اب کے اے زخمِ جگر تجھ کو بھی سی دیویں گے
ہاتھ میں کوئی گریباں کا جو تار آتا ہے

منھ پھرا کر تو ذرا دیکھ کہ عاشق کی طرح
سایہ پیچھے ترے بے صبر و قرار آتا ہے

بعد مرنے کے بھی مقبول ہیں مقبولِ خدا
شیرِ مُردوں کے پئے طوفِ مزار آتا ہے

کام بگڑا ہوا عاشق کا سنوارا نہ کبھو
اپنا مکھڑا ہی فقط تم کو سنوار آتا ہے

کس قدر ظلم پہ باندھی ہے کمر قاتل نے
روز ہر کوچے میں دو چار کو مار آتا ہے

مصحفی کوچۂ مژگاں میں جو جاتا ہے کبھو
واں سے آیا بھی تو بس سینہ فگار آتا ہے

123

ہماری سدِ رہ ہے ناتوانی
کہاں طور اور وہ شوقِ لن ترانی

نہ جاوے گی خموشی اپنی ضائع
کرے گی کام آخر بے زبانی

ترا نقشا تأمل کی جگہ ہے
قلم نے ہاتھ میں شوخی نہ مانی

فریبِ عشق کھایا تھا سمجھ کر
سمجھتے تھے ہم اس کو خصمِ جانی

ہمارے ذبح کو قاتل کی رفتار
رکھے ہے آبِ خنجر کی روانی

لگا مت دل بد و نیکِ جہاں سے
سوانح یاں کے سب ہیں آسمانی

نہیں آنکھوں سے گرتے اشکِ خونی
یہ نخلِ عشق کی ہے گل فشانی

شب آخر ہوگئی لیکن نہ نبڑی ترے کاکل کی عاشق سے کہانی
سمجھتا مرتبے کو گر وہ اُس کے نہ تھا جامی سے کچھ کم بھی فغانی
فرشتوں کا بھی دل چھینے گا اُس سے یہی ہے گر تری شیریں زبانی
گئے ہم زخمِ تیغِ یار لے کر عدم میں اپنے قاتل کی نشانی
مگر جانے کوئی شایستہ اس دم جو پھینٹا باندھیے شایستہ خانی
ہماری چشمِ دل کرنے کو روشن سیہ بختی ہے سرمہ اصفہانی
منھ اپنا دیکھ کر وہ چشمۂ حسن دکھاتے کم ہیں مصروعی کو پانی
جہاں دو لات آیا میرا جاوا کیا بابو نے مرغ اپنے کو پانی
کروں کیوں مصحفی برسات کی ہجو
نہایت لگتی ہے یہ رُت سہانی

124

نہ کہہ موسیٰ سے اب اپنی کہانی خموشی ہے جوابِ لن ترانی
خبر کیا ہے ہمیں پھولے گا گل کیا کہ ہے خاصہ خدا کا غیب دانی
سبک اتنا ہوا ہوں میں کہ میری کرے ہے روح بھی تن پر گرانی
نہ کھاؤں روزہاے رفتہ کا غم کہ یاد آتی ہے پیری میں جوانی
میں عاشق تھا عجب کیا ہے اگر ہو مری تربت کا سبزہ زعفرانی
نظر آتا ہے پت جھڑ باغ کا باغ ستم کیا کر گئی بادِ خزانی
تمھاری آرسی ہی دوست ٹھہری ہمیں کو منع ہے صورت دکھانی
نہ اپنے منھ سے کچھ نکلا دمِ نزع جو نکلا بھی تو آیا ہے مُلانی
سدا گلشن کی خاکستر کو عاشق سمجھتا ہے بہ از بردِ یمانی
کرے گا خونِ گل پامال اک دن یہ جوتا بلبلی کا سیف خانی
فلک صدمے سے اس کے کانپتا ہے مرا نالہ ہے گویا دھور دھانی

پھرا ہے کر کے منھ کالا شبِ ہجر　لگے کیونکر نہ شکل اس کی ڈرانی
بچے کس طرح اپنا خرمنِ عمر　کرے کیا خاک دہقاں پاسبانی
بنے ہے طشتِ آتش مہر دن کو　کریں ہیں تارے شب اخگر فشانی
قریبِ ساحل آپہنچی ہے کشتی　غنیمت ہے کوئی دم زندگانی
ہمیں اے مصحفی اسّی برس میں
نہیں اب اعتمادِ عمرِ فانی

125

کہوں جو بات کوئی اُس سے میں نصیحت کی　تو وہ کبھی نہ سنے مجھ سے پاک طینت کی
محبّ مرے مجھے لیلیٰ کی قبر پاس رکھیں　یہ عاجزی نے دمِ واپسیں وصیت کی
یہ خارِ سوزنِ جراح سے کھُلا مجھ پر　نہ کج سرشت سے جاوے کجی طبیعت کی
شریفِ کعبہ سے لے تا فقیہِ دانش مند　رکھے ہے دل میں ہر اک چاہ خوبصورت کی
یہ چاہتا ہے سوارِ سمندِ ناز مرا　اڑادے گھوڑے کی ٹاپوں میں خاک تربت کی
وداعِ عمرِ گرامی کے دن قریب آئے　رہی ہے زیست بھی کچھ اب تو ہے وہ ذلت کی
مزارِ قیس پہ دی جان آکے آخرکار　یہی تو بس سگِ لیلیٰ نے آدمیت کی
غبارِ دل نہ گیا اس کا بعدِ مرگ بھی کیا　نماز پڑھنے نہ آیا جو میری میت کی
بچایا رخ تو بہت اس نے وقتِ سرگوشی　میں بوسہ لے ہی لیا جھک کے کیا ہی فطرت کی
نگاہِ گرم سے دیکھے ہے سوے آئنہ یار　تہی نہ نور سے ہو جاوے چشم حیرت کی
ذرا تو دیدۂ عبرت کو مصحفی وا کر
نہ ہو گریز کہ دنیا جگہ ہے عبرت کی

126

مہرباں وہ بُتِ بے مہر کہاں مجھ پر ہے　ہے یہ سب جھوٹ جو یاروں کا گماں مجھ پر ہے
جی کھپا دیتی ہے بربادیِ گلہاے چمن　تب تو اک کوفت سی ایامِ خزاں مجھ پر ہے

کیا مرے خون کی پیاسی ہے تری تیغِ ادا دانت پیسے ہوئے جو سرخیِ پاں مجھ پر ہے
اس قدر چشمِ عزیزاں میں ہوا ہوں میں سبک کہ مری زیست کا جو دم ہے گراں مجھ پر ہے
مصحفی اور کو وہ گو نہ کرے ذبح اس طرح
تیغِ بیدادِ فلک سچ ہے رواں مجھ پر ہے

127

چاہنے سے رخِ نیکو کے نہ کچھ کام رکھے ہے بڑا مرد وہ جو دل کی ہوس تھام رکھے
جائے گل تکیہ یہ چاہے ہے مری غیرت کب یار ہاتھ اپنا تہِ عارض گلفام رکھے
چین مطلق نہیں آتا ہے شبِ ہجراں میں کیا کوئی سر کے تلے بالشِ آرام رکھے
کام اُس کا جو کوئی غیر سے بگڑے بگڑے اُس کی مرضی ہے مجھے موردِ الزام رکھے
حسن چاہے ہے کرے غیر سے سازش پیدا عشق چاہے ہے مجھے بیچ میں بدنام رکھے
ہم گرفتار اُسے کہتے ہیں جو مرتے مرتے کچھ پھڑکنے میں نہ باقی بہ تہِ دام رکھے
دیوے گو ابر و ہوا بادہ کشی کی تکلیف یارِ بن کیونکہ کوئی لب بہ لبِ جام رکھے
کیوں نہ مردم کو نظر آئے غروبِ خورشید پھول گیسو میں وہ اپنے جو سرِ شام رکھے
اس تلک جائے نہ عاشق کا تصور بہ غلط پاسباں جس کا علم ہاتھ میں صمصام رکھے
مصحفی کیا تری آنکھوں میں رہے اُس کی قدر
ہر کوئی یار سے جب نامہ و پیغام رکھے

128

گیسو کی شمیم اس کے گلشن میں جو جا نکلے پھر باغ کے کوچے سے ہرگز نہ صبا نکلے
معشوق وہی جس میں کچھ شرم و حیا نکلے پھر ساتھ حیا کے اک شوخی کی ادا نکلے
وادیِ عدم میں یہ کثرت ہے دفینوں کی آوے کوئی مردہ تو گڑنے کو نہ جا نکلے
یاروں کو وصیت ہے مر جاؤں جو فرقت میں اُس شوخ کے کوچے سے تابوت مرا نکلے
پابندِ حیا بحر افلاک کا گنبد ہے یہ بیٹھ نہ جاوے پھر گر اُس سے ہوا نکلے

پرہیز اسے کہتے ہیں گر پہلو سے نکلے بھی — تو صاف بدن اپنا عاشق سے چُرا نکلے
کیا دردِ سر اُن کو تھا جو میرے کڑھانے کو — ماتھے سے سحر اپنے صندل کو لگا نکلے
آشوبِ جہاں تیری رفتار کا عالم ہے — کیا کبکِ دری اس کے عہدے سے بھلا نکلے
ہے پاسِ ادب یاں تک اس کو مری مجلس میں — ٹوٹے بھی جو شیشہ تر اُس سے نہ صدا نکلے
میں تجھ سے یہ پوچھوں ہوں ہووے جو ترا قیدی — کیونکر ترے پھندے سے اے زلف دوتا نکلے
اے مصحفی اب تجھ سے ذکر اس کا نہیں اچھا
کیا جانے سنے کیا تو منہ سے ترے کیا نکلے

129

وہ شوخ جو ہولی میں کچھ سانگ بنا نکلے — اک حشر ہو واں برپا جس کوچے میں جا نکلے
اس بت کی جدائی کا کیا کام منہ سے گلا نکلے — جب وصل کے عالم کا فرقت میں مزا نکلے
وہ ذبح کی لذت کے لوٹے ہے مزے چپکے — کیا زیرِ دمِ خنجر بسمل سے صدا نکلے
تصویر کے دیدے کو دیکھا ہے جھکا کس نے — مانی سے اُن آنکھوں کی کس طرح حیا نکلے
اس کے لبِ شیریں کا میں جل کے لیا بوسہ — دشنام کے کھانے کا کچھ بھی تو مزا نکلے
وحشت ہمیں لے آئی مجنوں کی زیارت کو — کیا وادیِ مجنوں میں ہم آپ سے جا نکلے
مریخ کی خوں ریزی عالم کو نظر آوے — بازار سے وہ قاتل جب پان چبا نکلے
میں نے تبھی جانا تھا لاویں گے یہ آفت کچھ — چھوڑے ہوئے عارض پر جب زلفِ دوتا نکلے
اے مصحفی کچھ تو نے چھوڑا نہ فصاحت میں
کیا تازہ صفیروں سے اب خاک نوا نکلے

130

پیغام زبانی ہی اگر آئے تو کہیے — بچنے کی کوئی شکل نظر آئے تو کہیے
جو دل پہ گزرتی ہے مرے ہجر میں اُس کے — بھولا ہوا اک دن وہ ادھر آئے تو کہیے
بہ ہونے کی پوچھے ہے ہر اک اُس کے کہیں کیا — زخمِ دلِ مجروح جو بھر آئے تو کہیے

مدت سے گھٹنے زخم کی ہے ہم کو تمنا　　وہ باندھ کے شمشیر و سپر آئے تو کہیے
کیا خاک کہیں حالِ دلِ غم زدہ اپنا　　لب تک نفسِ زود اثر آئے تو کہیے
سو پردہ نشینی کے گِلے دل میں بھرے ہیں　　وہ گھر سے نکل کر پسِ در آئے تو کہیے
رنگینیِ گریہ کا جو ہے ماجرا اپنی　　مژگاں پہ کوئی لختِ جگر آئے تو کہیے
الفاظ نصیحت کے کئی لب پہ ہیں، اس سے　　اک شب دلِ دیوانہ جو گھر آئے تو کہیے
کس منھ سے کہیں اپنی بھی امید برآئی　　ہاں نخلِ تمنا میں ثمر آئے تو کہیے
سنتا نہیں یاں کوئی اسیروں کا فسانہ　　گلشن سے ادھر بادِ سحر آئے تو کہیے

اے مصحفی احوالِ عدم یوں نہیں کھلتا
گر ہاتھ میں میرے وہ کمر آئے تو کہیے

131

آرام کہاں گنبدِ افلاک کے نیچے　　ہاں پاوے تو پاوے تو اسے خاک کے نیچے
سو باغ میں مت اے گلِ تر تاک کے نیچے　　شبنم کا ہے ڈر سایۂ افلاک کے نیچے
آراستگی حور کی ہو یا کہ پری کی　　پوشاک ہے اُن کی تری پوشاک کے نیچے
چاہے ہے نزاکت ترے تن کی بُتِ کافر　　اک کُرتۂ ململ بھی ہو پوشاک کے نیچے
زاہد کے مسوڑوں کا کوئی رنگ نہ پوچھو　　سوزن زدہ ہیں ریشۂ مسواک کے نیچے
کس کشتۂ تازہ کا یہ سر اُس سے بندھا تھا　　خوں ٹپکے ہے اب تک تری فتراک کے نیچے
گرمی میں تو آیا ہے، نہیں مجھ کو گوارا　　آنا خِ رخ کا ترے رو پاک کے نیچے
سب جرمِ قمر تیرہ ہوا، شب کو گہن سے　　یہ آ نہ گیا ہووے کسی چاک کے نیچے
ہے جائے خطر یہ تو بڑا ان کا جگر ہے　　رہتے ہیں جو اُس گنبدِ کاواک کے نیچے
تو سیج پہ پھولوں کی صنم سووے، صد افسوس　　کانٹوں کا ہو بستر ترے غم ناک کے نیچے
ٹھکرا کے نہ چل قبر کو مردوں کی تو ظالم　　سوئے ہیں ذرا چین سے یہ خاک کے نیچے
رحم اس پہ نہ آوے کہ جو کھا تیغ کو تیری　　اک دم بھی نہ تڑپا ترے فتراک کے نیچے

لوح و قلم و کرسی و عرش اور یہ افلاک — اونچے ہیں پہ ہیں قوتِ ادراک کے نیچے
اب کے گئے جنگل کو تو دل خالی کریں گے — ہم بیٹھ کے اک روز کسی ڈھاک کے نیچے
کھا خونِ جگر خال کا لینا ہے جو بوسہ — استرِ بھی تو کچھ چاہیے تریاک کے نیچے
اے مصحفی اس بحر میں ہے شرط تجرّد
تو نبا بھی نہ ہو، چاہیے، پیراک کے نیچے

132

تقصیر اس میں کچھ تری اے آسماں نہ تھی — آسودگی نصیبِ دلِ ناتواں نہ تھی
کہہ سن کے اُس سے خط کا جو لاتا مرے جواب — قاصد کے منھ میں تھی تو زباں پر زباں نہ تھی
انکار کیوں کرے ہے تو کیا اس کا فائدہ — لیلیٰ مقیم نجد شب اے سارباں نہ تھی
میرے لیے پہاڑ بنی تھی شبِ فراق — دشمن کی کون کون سی ساعت گراں نہ تھی
کیا زندگی عذاب سے کاٹی ہے کیا کہوں — سینے میں میرے سانس مری کب سناں نہ تھی
کیا ہم ہی مستِ بادۂ غفلت تھے بزم میں — اپنی خبر تمھیں بھی تو شب مہرباں نہ تھی
کیا انقباضِ دل کو میں کرتا رقم کہ رات — چلتا تھا گر قلم تو سیاہی رواں نہ تھی
مرغِ چمن کی رات سیاہی میں بڑھ گئی — بجلی بھی کوندتی طرفِ آشیاں نہ تھی
آخر بہ رنگِ غنچہ مرا دل چٹک گیا — از بس کہ مجھ کو طاقتِ ضبطِ فغاں نہ تھی
کیوں لے گیا یہ ناقۂ لیلیٰ کو تو اُدھر — کیا راہِ نجد یاد تجھے سارباں نہ تھی
آتی رہیں صفیں کی صفیں زیرِ تیغِ ناز — کب اس گلی میں خون کی ندی رواں نہ تھی
وہ تیغیں مارتا تھا مجھے زندہ جان کر — ہر چند میرے لاشۂ بے حس میں جاں نہ تھی
میں کیا کہوں کہ اس کی سیاہی نے کیا کیا — ایسی کبھی فراق کی شب جاں ستاں نہ تھی
مجھ تیرہ بخت کے جو نصیبوں میں تھا نہ پھول — سوسن کی کیا کلی بھی کوئی باغباں نہ تھی
کیوں ہو گئے شراب سے غفلت کی مست یار — کیا ان پہ کچھ عدم کی حقیقت عیاں نہ تھی
تا دو قدم تو دوڑتے ہم پیچھے یار کے — دیکھا تو زیرِ خاک یہ بزمِ رواں نہ تھی

ہم پر ہی اس نے ترکشِ مژگاں تھے سر کیے
دشمن کے واسطے تری ابرو کماں نہ تھی

پکڑیں[1] تھیں ہم نے ناقۂ لیلیٰ کی چوریاں
جس دم مہار کف میں ترے سارباں نہ تھی

کیوں اُس کے دیکھتے ہی گُھٹا دم مرا صنم
مسی ترے لبوں کی جو کافر دھواں نہ تھی

فکرِ بلند سے مرے دیواں میں مصحفی
وہ کون سی زمین تھی جو آسماں نہ تھی

133

پھڑکے ہے نبض دام میں مرغِ اسیر کی
ہے یاد اُس کو زمزمۂ ہم صفیر کی

کیا قلعۂ سپہر پہ چڑھ جائے اشکِ آہ
گولے کا پلہ اور نہ وہاں زد ہے تیر کی

جس کے صفائے سینہ میں ہے برق کا سا ڈھنگ
مانی سے کھنچ سکے گی نہ گات اس شریر کی

جا رہیے اس نگر میں تو دل کو نہ ہووے رنج
صورت جہاں نظر نہیں پڑتی فقیر کی

اللہ رے فراستِ معشوق آفریں
نظروں میں بوجھ جائے ہے سب کے ضمیر کی

گریاں قفائے قافلہ جاتے ہیں ہم چلے
اُٹھتی نہیں ہے گرد ہمارے بھیر کی

عاشق ملے نہ چشم کہ ہولی کی بزم میں
چلتی ہے زور گھاٹ پہ مٹھی ابیر کی

دریائے خوں بہانے کو حاضر ہے کوہکن
شیریں کو کس لیے ہے ہوس جوئے شیر کی

غفلت کے پردے میں یہ جہاں دیکھتے ہیں ہم
بینا ہو آنکھ خواب میں جیسے ضریر کی

میں دیکھ اس کو رشک سے جل بھن ہوا کباب
خوں میں بھری ہوئی تھی سری اس کے تیر کی

تاج اُس کے موے سر ہیں تو تخت اُس کا نقشِ پا
آزاد کو ہوس نہیں تاج و سریر کی

کیونکر چڑھے نہ لہر ترے خاکسار کو
لپٹی ہوئی بدن سے ہے ناگن حصیر کی

سب کبک مر گئے الفی اس کی دیکھ کر
لائی ستم اُنھوں پہ یہ کثرت لکیر کی

جامِ جہاں نما سے لڑانے لگی ہے آنکھ
رتبے میں اپنے کم نہیں چملی فقیر کی

پہلے جب اُس پہ رنگِ محبت چھڑک لیا
چالیس صبح تب گلِ آدم خمیر کی

1۔ اصل: پکڑے تھیں

رانجھا کے پاس جاتی ہے دریا کو پیر کر کہتا ہے شوق آفریں ہمت پہ ہیر کی
کھینچا ہے تیرہ بختیِ آزاد نے جو طول بنی تلک ہے اس کے سیاہی لکیر کی
نامرد اُس کی جعد کا کیا کر سکے سُراغ جب سانپ سے زیادہ ہو ہیبت لکیر کی
رو رو ترے فراق میں اندھا وہ ہوگیا یوسف تجھے خبر ہے کچھ اس مردِ پیر کی
لکھا ہے اس کو میں نے قلم ریز مصحفی
تحریر دیکھ اس غزلِ دل پذیر کی

134

نہ فقط شیشہ تنوں کے ہیں بدن پتھر کے رکھتے ہیں دل بھی تو یہ عہد شکن پتھر کے
ان کو کس رنگ میں دوں لعلِ یمن سے تشبیہ لب ہیں گل برگ ترے لعلِ یمن پتھر کے
کس طرح دعوتِ نوشابہ سکندر کھاوے کھانے کھلوائے اُسے جب کہ یہ زن پتھر کے
شہر کی گلیوں میں مرجاتے ہیں جو دیوانے سنگِ اطفال انھیں دیتے ہیں کفن پتھر کے
قوم کو عاد کی برباد کیا خالق نے گرچہ رکھتے تھے پہاڑوں میں وطن پتھر کے
جب کہ کرتا تھا رقم صورتِ شیریں فرہاد پھول جھڑتے تھے دمِ تیشہ زدن پتھر کے
روے خوش جان جواہر کہ ہوئے جاتے ہیں چشمۂ حسن سے سیراب چمن پتھر کے
اب جفاؤں کے اُٹھانے کی نہیں تاب ہمیں کاش ہوجائیں ہم اے چرخِ کہن پتھر کے
صرف افشاں میں تری وہ بھی کھرل ہوجاویں لاوے تارے جو بنا چرخِ کہن پتھر کے
تعب و رنج اُٹھاتے نہیں کیا کیا شبِ فکر دل مکرر رکھتے ہیں یہ اہلِ سخن پتھر کے
چاندی سونے کے بنے ہیں تنِ خوبانِ جہاں پر بگاڑا ہے انھیں دے کے دہن پتھر کے
سخت باتیں تری کیونکر نہ لگیں دل کو مرے اب تلک میں نے سنے تھے نہ سخن پتھر کے
خاک اُڑاتا ہے فلک اب تلک اُن کے سر پر ہیں پتھورا کے جہاں قصرِ کہن پتھر کے
کیوں ترے سامنے خوبانِ جہاں ہیں خاموش گویا خلقت میں بنے ان کے دہن پتھر کے
چین والوں کے صنایع پہ جو عبرت آئی ناتے بچیں گے بنا اہلِ ختن پتھر کے

مصحفی آنکھیں یہ کس بُت کی اُنھوں نے دیکھیں
جو نہیں بھاگتے ہیں مارے ہرن پتھر کے

135

تیشہ دیتا ہے لگا چشم و دہن پتھر کے — حور بنتے ہیں تراشے سے بدن پتھر کے
تیرے دیوانے کریں چاک اُنھیں بھی تہِ خاک — ان کے بالفرض جو ہوویں بھی کفن پتھر کے
نہیں الماس کے آویزے ترے کانوں میں — بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں برگِ سمن پتھر کے
خون روتے ہیں ترے عاشقِ خاموش سدا — چشم یاقوت کی رکھتے ہیں، دہن پتھر کے
سنگِ تربت پہ رکھے تا نہ کوئی بھول کے پاؤں — ضعف سے چھاتی پہ جن کی ہیں کفن پتھر کے
مت پتھورا کی عمارت کا نشاں پوچھ کہ یاں — خاک میں مل گئے سو قصرِ کہن پتھر کے
میری تربت پہ رکھے تا نہ کوئی بھول کے پاؤں — رخ سے ہوتے ہیں عیاں چین و شکن پتھر کے
دیکھ تو ہوتے ہیں ظالم کے پسر بھی ظالم — سنگ ریزے میں بھی شیشہ شکن پتھر کے
اتنی سختی نہ عزیزوں پہ روا رکھ منعم — تجھ کو دبنا ہے تلے سیکڑوں من پتھر کے
غیر از سختیِ ایام نہ ان سے دیکھا — تارے رکھتا ہے مگر چرخِ کہن پتھر کے
پہلوانوں کے جو شاگرد ہیں امرد کتنے — پھول سے رُخ ہیں جوان کے تو بدن پتھر کے
ژالہ باری یہ ہوئی باغ میں جاتے ہم پر — ہم نشانہ ہی رہے تا بہ چمن پتھر کے
دلِ بیمارِ برہمن کی دوا کیونکر ہو — کہ بتوں کے ہیں سیب و ذقن پتھر کے

مصحفی شمع دل افسردہ جلی محفل میں
سنگ ریزے تھے مگر زیرِ لگن پتھر کے

136

گر قتل مرا آپ کو منظورِ نظر ہے — تو دیر ہے کیا، آیئے یہ طشت ہے یہ سر ہے
جس دن سے میں دیکھے ہیں ترے پائے حنائی — خونابِ دل آنکھوں سے رواں آٹھ پہر ہے

لڑکے لیے پھرتے ہیں عبث ہاتھ میں پتھر ے آپ ہی دلِ دیوانہ مرا شہر بدر ہے
اُس شوخ نے زیور کو جو پہنا ہے تو اُس کی سینے پہ کبھی اور کبھی بازو پہ نظر ہے
کیا عیش میسر ہو ہمیں وصل کی شب کا اُس رخ سے نقاب اُٹھتے ہی آغازِ سحر ہے
پانی تو چھڑک اُس پہ جو کرتا ہے تو کلی اب تک ترے بسمل میں ذرا جنبشِ پر ہے
دل سے نہیں جاتی ہوسِ کوچۂ قاتل جاتا ہوں وہاں میں کہ جہاں جی کا ضرر ہے
کس ناوکِ مژگاں کا رہے ہے اسے خطرہ خورشید کے دن رات جو ہتواں سے سپر ہے
عاشق کو نہیں شہرِ عدم میں بھی رہائی گہہ فکرِ دہاں ہے تو گہے فکرِ کمر ہے
دنبالہ نہیں یہ تو گریز اس کو سمجھنا سرمے کو بھی آنکھوں سے تری جان کا ڈر ہے

اے مصحفی صحرا کا میں ہوں بیدِ مولّہ
جز داغِ جگر مجھ میں نہ گل ہے نہ ثمر ہے

137

کیا ڈراتی ہے نت آنے سے، اجل آوے بھی پاک ہو قصہ کہیں جان نکل جاوے بھی
آمد آمد میں ہم اس گل کی موئے جاتے ہیں ایک دن وصل کی شب منھ کہیں دکھلاوے بھی
مار کو بھی نہیں آتی یہ رسن بازیِ زلف چاہیے کھاوے بل ایسا جو وہ بل کھاوے بھی
اختلاطِ عجب آئینے سے رکھتا ہے وہ شوخ آپ ہی دیکھے اُسے، آپ ہی شرماوے بھی
ہم تو مرتے ہیں تمنا ہی میں باراں کی، ہوا ابر کو لاوے کہیں، برق کو چمکاوے بھی

مصحفی گر طرفِ باغ گیا، کیا ہے عجب
کسی گل پھول سے دل اپنا وہ بہلاوے بھی

138

چاہیے ہم کو جگہ مثلِ نگیں تھوڑی سی بیٹھ رہنے کو ہے درکار زمیں تھوڑی سی
منزلِ مرگ کے آپہنچے ہیں نزدیک اب تو کر مدد اے نفسِ بازپسیں تھوڑی سی
ناخوشی اپنی وہ ظاہر نہیں ہونے دیتی مجھ سے روکھی ہے تری چینِ جبیں تھوڑی سی

رستے والوں کو ڈسا سانپ نے چوٹی کے، مباف
رہ گئی ڈولی کے باہر جو کہیں تھوڑی سی

ہٹ پہ آجاتے ہیں جب اپنی وہی کرتے ہیں
ضد بھی رکھتے ہیں یہ طفلانِ حسیں تھوڑی سی

سخت جانی نے مری قہر کیا، قاتل کی
گڑ گئی آبِ دمِ خنجرِ کیں تھوڑی سی

کوئی دم اور بھی اس کی متحمل ہو کہ اب
تلخیِ مرگ ہے اے جانِ حزیں تھوڑی سی

اُس کے مقتول کے لاشے سے پئے پابوسی
موجِ خوں اُٹھتی ہے تا دامنِ زیں تھوڑی سی

خال اک اور بھی رکھ کنجِ دہن پر کہ صنم
ہے ابھی موجِ تبسم نمکیں تھوڑی سی

پانو ناقے کے، طرف نجد کی اُٹھتے ہیں گراں
تھی ملول آج مگر ناقہ نشیں تھوڑی سی

خانۂ دل پہ بنا عرش کی تو رکھ تو سہی
پھیل جاتی ہے عمارت میں زمیں تھوڑی سی

سلطنت ہند کی شانے کو مبارک ہووے
اپنے قبضے میں بھی ہے زلف کی چیں تھوڑی سی

مصحفی شرک بھی ایسے کا نہیں یار برا
کفر کے ساتھ ہو گر رغبتِ دیں تھوڑی سی

139

اُس کی اُتری جو کبھی چینِ جبیں تھوڑی سی
پہلے کہہ بیٹھیں گے کچھ دل کی ہمیں تھوڑی سی

اس میں عالم کی سب آبادی و ویرانہ ہے
یہ جو کچھ پانی سے باہر ہے زمیں تھوڑی سی

ایک بازار میں خاتم کے نہ نکلے شیشہ
اپنی سدھ لیوے جو وہ پردہ نشیں تھوڑی سی

پانو پھیلانے کی خاطر نہ لحد ہاتھ آئی
جا ملی بھی تو ہمیں زیرِ زمیں تھوڑی سی

دھیان میں جلد جو آتی نہیں رکھ چھوڑی ہے
لکھ کے تصویر تری مائلِ چیں تھوڑی سی

اُس کی بالیں سے بس اُٹھتے ہی ہوئی وہ بھی ہوا
تھی جو ہنکار دمِ بازپسیں تھوڑی سی

تشنۂ شورِ ملاحت ہوں خدا را جرّاح
ہو مرے زخم کی پٹی نمکیں تھوڑی سی

اپنے مقتول کی چتون وہ سمجھ کہتا ہے
مجھ سے اب تک بھی ترے دل میں ہے کیں تھوڑی سی

تل برابر ہو جو اخگر تو جہاں دیوے پھونک
چاہ تھوڑی بھی اگر ہو تو نہیں تھوڑی سی

صاحبِ ناز کی ہو یا کہ کسی ساز کی ہو
مجھ کو تو بھاتی ہے آوازِ حزیں تھوڑی سی

مصحفی بیٹھ رہوں، ہو کسی صحرا میں فقیر
دے مجھے رہنے کو دہقاں جو زمیں تھوڑی سی

140

یا رب یہ کس بلا کے مقابل کیا مجھے　جس کی نگاہِ تیز نے بسمل کیا مجھے
ہر گردباد ناقۂ لیلیٰ نظر پڑا　جب شوق نے رواں پسِ محمل کیا مجھے
ہے زور رسم کارکنانِ زمانہ کی　دل میرا دے کے یار کو بیدل کیا مجھے
ناز و ادا کی لہریں ہیں میرے کنار میں　دریائے حسن کا ترے ساحل کیا مجھے
واں رشک میکشی نے خبر محتسب کو کی　یاں نشۂ سرور نے غافل کیا مجھے
کیوں شعر و شاعری کو برا جانوں مصحفی
جس شاعری نے عارفِ کامل کیا مجھے

141

ظالم نے یہ کیا ظلم کیا، جان گنوائی　اے وائے خدا! بے اجل اپنی اجل آئی
مانی نے یہ کیسی مجھے تصویر دکھائی　بس دیکھتے ہی جس کے مری جان پر آئی
آنکھوں میں نشہ، چھائی ہوا، رنگ میں سرخی　سر پنجہ حنائی، و خوش اسلوب کلائی
غش پہلی ہی تصویر میں آیا تھا مجھے تو　یہ دوسری تو مجھ پہ ستم اور بھی لائی
یک جام مئے کفر و دگر جام مئے دیں　شد نشہ دوبالا کن ایں ہست خدائی
ہے حسن وہ معشوق کے سودے میں مرا دل　یعنی کہ فُلانی و کرائی و کرائی (کذا)
پُتلی مری آنکھوں کی سدا کاسہ بکف ہیں
اے مصحفی ان سے نہ گئی طرزِ گدائی

142

دو چار دن سے اپنا نہ ملنا نہ دید ہے　وہ خوش رہیں جنھوں کو وصال اُس کا عید ہے

اے برق کوند جا کے کسی پکے کھیت پر　مت جی ڈرا ابھی مری کھیتی خوید ہے
بجلی کی کوند سے مرے چندھیا گئی ہے آنکھ　کیا جانیے یہ تیغ کی کس کی کشید ہے
قاتل تری گلی بھی بداؤں سے کم نہیں　ہر ایک گھر میں جس کے مزارِ شہید ہے
کیسا جوابِ نامہ کہ ظالم کے پاس سے　قاصد کا جیتے پھرنا ہی خط کی رسید ہے
سر بیچتے ہیں، لیتے ہیں قیمت میں زخمِ تیغ　بازارِ عشق کی یہ فروش و خرید ہے
تربت سے میری اُگتی ہے گل مہندی کوئی　تا سمجھیں سب یہ فندقِ پا کا شہید ہے
شاید کہ رُت گلاب کی آ پہنچی عنقریب　شیشوں کی اس برس جو نہایت خرید ہے
واں روز چلتی ہیں خز و دیبا پہ قینچیاں　یاں جامۂ حیات کی قطع و بُرید ہے
نامے کے پرزے دے کے مرے مجھ کو نامہ بر　کہنے لگا یہ خط کی تمھارے رسید ہے

مت چشمِ کم سے مصحفیِ خستہ جاں کو دیکھ
یہ پیر ایک تازہ جواں کا مرید ہے

143

کنعاں سے گرچہ مصر کا عرصہ بعید ہے　پر جنسِ یوسفی کی اسی جا خرید ہے
زلفوں کی راستی میں کجی کس طرح سے آئے　دونوں کے درمیاں میں کلامِ مجید ہے
ہیں پردۂ ملائمتِ دل میں خاکسار　جس طرح زیرِ آب زمیں ناپدید ہے
خالِ سیہ نے زلف کو دی ہے عناں دراز　جس طرح ملکِ شام کا حاکم یزید ہے
گھوڑے کے سم تلے نہ مزاروں کو ان کے روند　آسودگانِ خاک پہ ظلمِ شدید ہے
نیرنگ سے مسی کے ترا غنچۂ دہن　نیلم ہے، لاجورد ہے، کوہِ حدید ہے
قاصد نہ آئے واں سے تو کچھ غم نہیں کہ یاں　جاے رسید نامہ اجل کی رسید ہے
قیمت میں دل کی بوسہ جو دیتا ہے وہ مگر　سمجھا ہے اس کو بھی کہ یہ مالِ مزید ہے
رکھے گئے ہیں خنجر و شمشیر سان پر　قربانیانِ عشق کا سامان عید ہے
اُگتا ہے لالہ باغ سے جس جا کہ خوں چکاں　زیرِ زمیں کوئی تو گڑا واں شہید ہے

حا یک نے وہ بُنا ہے ترا پیرہن پری   درزی کی دوخت جس میں نہ قطع و بُرید ہے
روز و شبِ فراق کو میں آزما چکا   دونوں کے اختتام کا عرصہ بعید ہے
کیسا یہ دن ہے جو نہیں لاتا ہے رو بہ شام   کیسی یہ شب ہے جس کی سحر ناپدید ہے
کھلتا ہے قفلِ عیش مرا اُس سے مصحفی
جس کے ازار بند میں چھوٹی کلید ہے

144

چشمِ تر اشکوں سے موتی جھیل ہے   آہِ گردوں سیر بھی جبریل ہے
دل میں ہیں سوراخ عاشق کے جو لاکھ   یہ محرم کی مگر قندیل ہے
متصل ہے گور کے کوچے کی راہ   اس میں فرسخ ہے نہ کوئی میل ہے
خال رخسارے پہ لیلیٰ کے نہیں   چشمِ بد کے واسطے یہ نیل ہے
چشم سے تیری نہیں کاجل جدا   اُس میں اور سُرمے میں رہ اک میل ہے
مصحفی کچھ کم نصاریٰ سے نہیں
اُس کا جو قرآں ہے وہ انجیل ہے

145

بول اُٹھا میں جو نظر شامِ غریباں آئی   جی جلانے کو مرا پھر شبِ ہجراں آئی
خط کی تحریر ترے حسن کی خواہاں آئی   مورچے کو طمعِ ملکِ سلیماں آئی
جب گیا یار کی محفل میں تو واں جم بیٹھا   آدمیت نہ تجھے، اے دلِ ناداں! آئی
اتنا مغرور نہ ہو اپنے پہ چپ اے سنبل   گوشمالی کو تری کاکلِ پیچاں آئی
تیری تصویرِ خیالی کو بھی خطرہ ہی رہا   وہ مرے گھر نہ کبھی موسمِ باراں آئی
کس جگر خستہ کا ہووے گا لہو نوش کیا   تم میں سرخی بہت اے خارِ مغیلاں آئی
کوئی جیتا نہیں یاں اُلٹے پھرا بس قاتل   غیب سے جب یہ صدا از درِ زنداں آئی
شکوہ مجنوں کو رہا اُس سے بھی گا ہے لیلیٰ   نجدیوں میں تو کسی رات نہ مہماں آئی

جان کو تن سے نکلنے میں بڑا سوچ رہا — لب تک آئی پہ بہ صد حسرت و حرماں آئی
گریہ ہے منع ترے عہد میں، مجرم ہوئے ہم — اشک کی بوند اگر تا بُنِ مژگاں آئی
ناقہ لیلیٰ کا گیا، دور نکل، اے مجنوں! — نیند رستے میں تجھے زیرِ مغیلاں آئی
طعن ہم زادوں سے لیلیٰ کے رہا دل میں خلش — چوری چوری جو کبھی تا بہ دبستاں آئی
سیرِ یوسف کو زلیخا طرفِ زنداں رات — شوق تو دیکھ کہ پنہاں گئی پنہاں آئی
خط کے آئے پہ یہ معلوم ہوا اُس لب پر — فوجِ زنگی طرفِ ملکِ بدخشاں آئی
تیرہ بختانِ ازل کا ہے ستارہ چمکا — واں جو مسی سے جِلا برسرِ دنداں آئی
کشتۂ قد کی ترے پہنچی جو میت اُس جا — اک قیامت طرفِ گورِ غریباں آئی
نامِ اغیار کو جھٹ پٹ وہ گیا کل بتلا — میں جو پوچھا تو مرے نام پہ نسیاں آئی
کھا کے خفت جو گئی حسن و صفا سے اُس کی — آرسی پھر نہ دوچارِ رخِ جاناں آئی
اور تو اور کہ اُس نے بھی مجھے چھوڑ دیا — بے کسی بھی نہ مری قبر پہ گریاں آئی

مصحفی مردہ سے کچھ کم تو نہ تھا یار بغیر
تجھ میں پھر جان تو اے صورتِ بے جاں آئی

رباعیات

اول جو کوئی مرگ گوارا کر لے
فاقے کے تئیں آنکھ کا تارا کر لے
کیونکر نہ حساب زندگی کا اپنی
دو دن ہی میں پورا وہ بچارا کر لے

افسوس کہ عشرۂ محرم بھی چلا
دس روز یہ یوں اُڑ گئے جیسے کہ ہوا
اب شیشۂ دل پہ کیونکہ آوے گی شکست
نے سنگ زنی ہے اور نہ شیون وہ رہا

سلام

سلامی دیکھ امامِ زماں کے تن کی طرف
پھر اُس کے بعد لہو ڈوبے پیرہن کی طرف
لگے تھے زخم زبس پیکرِ مقدس پر
نگاہ جاتے ہوئے ڈرتی تھی بدن کی طرف
وہ محوِ یادِ خدا تھا، حسینؓ کا دمِ ذبح
خیال گور کی جانب تھا، نے کفن کی طرف
کھلی تھی آنکھ جو اُس سرورِ شہیداں کی
رہی تھی دیکھ وہ اُس وقت بھی بہن کی طرف
چڑھا تھا سینے پہ جب اس کے شمر آنکھیں نکال
وہ تک رہا تھا خداوندِ ذوالمنن کی طرف
کیا تھا ابنِ علیؓ نے تو قصد کوفے کا
قضا لے آئی اسے کربلا کے بن کی طرف

کُدائے لاشوں پہ گھوڑے ستم شعاروں نے
نگاہ کیجیو اس قوم کے چلن کی طرف

نماز پڑھ کے شہیدوں کو دفن تو کرتا
نہ آیا حیف کوئی کارواں بھی رن کی طرف

گیا جو شام میں یہ قافلہ اسیروں کا
تو زن تکے تھی سوے مرد، مرد زن کی طرف

زباں جو چلتی تھی فرفر یزید کے آگے
رہا تھا گھور سکینہ کے وہ دہن کی طرف

رچائی شادیِ قاسم تو پر عزیزوں کا
نہ مہندی کی ہے طرف دھیان نے لگن کی طرف

گلے میں طوق ہے عابد کے پانو میں زنجیر
فلک نظر تو کر اس رنج اور محن کی طرف

تمام آہوے صحرائی روئے جوڑ کے سر
خبر یہ قتل کی جس دم گئی ختن کی طرف

سیاہ پوش ہے سوسن تو سینہ چاک ہے گل
پڑا ہوا ہے عجب ماجرا چمن کی طرف

فرشتے کان لگائے ہوئے ہیں ہر شبِ غم
فلک پہ دل سے ہی فریادِ مرد و زن کی طرف

نہ بیٹھ جائے یہ صدموں سے شور و شیون کے
رہے ہے دھیان مرا گنبدِ کہن کی طرف

ہزار حیف کہ صغرا اس آرزو میں رہی
صبا بھی بن کے نہ قاصد گئی وطن کی طرف

یہ چاہے ہے کہ کھڑے ہو کے مرثیہ وہ سنے
جو گزرے تعزیہ داروں کی انجمن کی طرف

ہے مصحفی کا کلامِ فصیح میں یہ سلام
ذرا زباں کی طرف دیکھ اور سخن کی طرف